بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان
صفدرؒ

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
صوفی عبد الحمید
خان سواتیؒ

ماہنامہ

الشریعہ

گوجرانوالہ، پاکستان

مؤسس ومدیر

حضرت مولانا ابوعمار
زاہد الراشدی

مدیر منتظم

ناصر الدین خان عامر

جلد ۳۶۔ شمارہ ۹۔ ستمبر ۲۰۲۵ء

مجلسِ مشاورت

قاضی محمد رویس خان ایوبی۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی۔ پروفیسر غلام رسول عدیم۔
ڈاکٹر سید متین احمد شاہ۔ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر۔

مجلسِ تحریر

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل ۔ مولانا سمیع اللہ سعدی۔ ڈاکٹر حافظ محمد رشید۔ مولانا عبد الغنی محمدی۔
مولانا فضل الہادی۔ مولانا حافظ خرم شہزاد۔ مولانا محمد اسامہ قاسم۔ ہلال خان ناصر۔

معاونین

مولانا حافظ کامران حیدر۔ مولانا حافظ شیراز نوید۔ مولانا حافظ دانیال عمر۔ حافظ شاہد الرحمٰن میر۔

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org — editor@alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

فہرست

مدنی مسجد اسلام آباد کا معاملہ 5

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی / رپورٹ: ادارہ الشریعہ

مسجد گرانے کے متعلق چند اہم اصولی سوالات 8

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

”خطباتِ فتحیہ: احکام القرآن اور عصرِ حاضر“ (۳) 14

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی / مولانا ڈاکٹر محمد سعید عاطف

اکیسویں صدی میں تصوف کی معنویت اور امکانات 24

مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی

خطبہ حجۃ الوداع اغیار کی نظر میں 35

مولانا حافظ واجد معاویہ

شہیدِ کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت 38

مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی

خادمۂ رسول ؐ حضرت امِ رافع سلمیٰ ؓ 45

مولانا جمیل اختر جلیلی ندوی

خواتین کا مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا 49

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

خطبہ، تقریر اور نمازِ جمعہ میں لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال 51

مولانا مفتی سید انور شاہ

سوشل میڈیا کے منفی استعمال کے نتائج 53
مولانا مفتی عبد الرحیم

حدیث میں بیان کی گئی علاماتِ قیامت کی تاریخی واقعات سے ہم آہنگی، بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (۴).... 56
ڈاکٹر محمد سعد سلیم

”اسلام اور ارتقا: الغزالی اور جدید ارتقائی نظریات کا جائزہ“ (۷).. 76
ڈاکٹر شعیب احمد ملک / مترجم: ڈاکٹر ثمینہ کوثر

کُل جماعتی دفاعِ شعائر اللہ سیمینار: اعلامیہ، سفارشات، قرار دادیں................................ 85
قرآن و سنہ مووومنٹ پاکستان

غزہ پر اسرائیل کا نیا حملہ: فلسطین کا مستقبل کیا ہوگا؟.. 96
ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

East and West: Different Futures for Different Pasts.......................... 103
Abu Ammar Zahid-ur-Rashdi

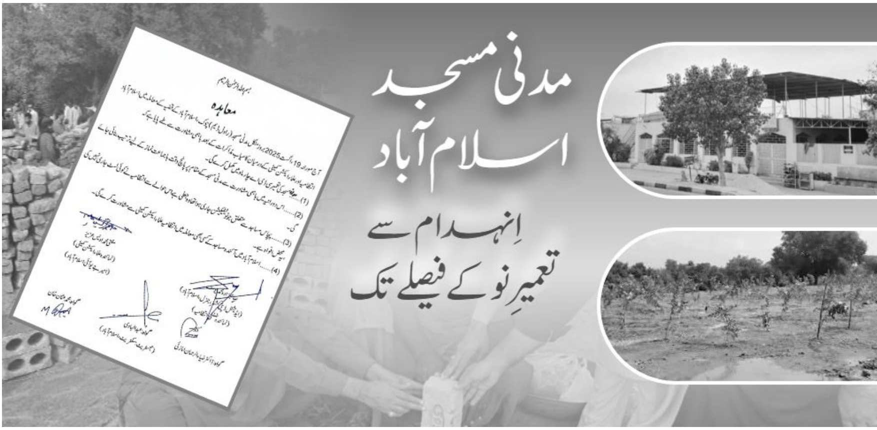

مساجد و مدارس کو مسمار کرانے کی کارروائی کو قانونی اور شرعی حیثیت کے حوالے سے پیش کرنا ہمارے نزدیک فریب کاری سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ اگر بات صرف قانون کی عملداری یا شرعی حیثیت کی پاسداری کی ہوتی تو اس کا نشانہ صرف مساجد نہ بنتیں بلکہ اسلام آباد میں غیر قانونی قبضوں کی باقی صورتیں بھی اس میں شامل ہوتیں، اور کسی بھی عنوان سے سرکاری اراضی پر بغیر اجازت تعمیر کی جانے والی تمام عمارتوں کے خلاف اجتماعی آپریشن کا فیصلہ ہوتا۔ باقی تمام غیر قانونی قبضوں کو نظر انداز کر کے صرف مساجد کے خلاف آپریشن اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اصل ہدف ''لاقانونیت'' نہیں بلکہ ''مسجد'' ہے اور اسلام آباد کے حکمران دنیا کو اپنے سیکولر ہونے کا یقین دلانے کے لیے مساجد کے خلاف آپریشن کرنا چاہ رہے ہیں۔

(ابو عمار زاہد الراشدی — ۱۵ اگست ۲۰۲۵ء)

اِنہدام سے تعمیرِ نو کے فیصلے تک

اسلام آباد کی مدنی مسجد، جو مری روڈ (راول ڈیم چوک) کے قریب برسوں سے عبادت کے لیے استعمال ہو رہی تھی، اگست 2025ء میں اچانک انتظامیہ کی کارروائی کا نشانہ بن گئی۔ اس انہدام نے نہ صرف مقامی لوگوں اور دینی طبقات میں بے چینی پیدا کی بلکہ ریاست اور مذہب کے درمیان تعلق کی بحث ایک بار پھر چھیڑ دی۔

9 اور 10 اگست کی درمیانی شب سی ڈی اے اور ضلعی انتظامیہ کی ٹیموں نے بھاری مشینری کے ذریعے مسجد اور اس سے منسلک مدرسے کو مسمار کر دیا۔ انہدام کے فوراً بعد علاقے میں گھاس اور پودے لگا دیے گئے۔ حکام کے مطابق یہ عمارت گرین بیلٹ پر غیر قانونی طور پر موجود تھی اور وی آئی پی روٹ پر ہونے کے باعث سیکیورٹی رسک سمجھی جاتی تھی۔

حکومت کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ مدرسے کو پہلے ہی مارگلہ ٹاؤن میں منتقل کر دیا گیا ہے جس پر کروڑوں روپے لاگت آئی۔

حکومت کی طرف سے یہ اچانک کارروائی شدید عوامی ردعمل کا باعث بنی۔ مذہبی جماعتوں نے موقع پر احتجاجی اجتماع منعقد کیا اور جمعہ کی نماز ادا کی۔ بعد ازاں ملبے سے علامتی تعمیر بھی شروع کی گئی۔ پولیس اور مظاہرین کے درمیان کشیدگی کی خبریں آئیں اور دارالحکومت میں ایک تناؤ محسوس کیا جانے لگا۔

وزارت داخلہ نے وضاحت دی کہ مدرسے کو اس کی انتظامیہ کی رضامندی سے گرایا گیا ہے اور متبادل مقام پہلے سے فراہم کیا گیا ہے۔ تاہم وفاق المدارس اور دیگر دینی جماعتوں نے اس موقف کو مسترد کرتے ہوئے اسے مذہبی آزادی پر حملہ قرار دیا۔

بالآخر حکومت نے دباؤ بڑھنے پر جمعیۃ علماء اسلام (ف) اور اسلام آباد کے مقامی علماء سے مذاکرات شروع کیے جو تین چار دن جاری رہے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں 20 اگست کو ایک تحریری معاہدہ طے پایا جس کے مطابق:

- مسجد کو اسی جگہ پر چار ماہ کے اندر دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔
- تعمیر کے دوران پانچوں نمازوں کا بندوبست باہمی مشاورت سے ہوگا۔
- مستقبل میں مساجد کے معاملات علماء سے مشاورت کے بغیر نہیں نمٹائے جائیں گے۔
- "50 مساجد کی فہرست" کو سرکاری سطح پر جعلی قرار دے دیا گیا۔

مدنی مسجد کا واقعہ محض ایک عمارت کے انہدام کا معاملہ نہیں بلکہ ریاست اور مذہب کے تعلق کی تازہ ترین جھلک ہے۔ حکومت کے نزدیک یہ اقدام قانون اور سیکورٹی کے تحت تھا، مگر دینی حلقے اسے اپنے عقیدے اور مذہبی شناخت پر حملہ سمجھتے ہیں۔ بالآخر حکومت نے دباؤ میں آکر مسجد کی تعمیرِ نو پر رضامندی ظاہر کی، جو اس بات کی علامت ہے کہ پاکستان میں مذہبی طبقات اب بھی فیصلہ سازی میں اثرانداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. سی ڈی اے نے مدنی مسجد اور مدرسہ 9 اور 10 اگست کی درمیانی شب مسمار کیا، بعد ازاں جگہ پر پودے لگائے گئے۔ (ڈان، ۱۰ اگست ۲۰۲۵ء)

۲. وزیرِ مملکت داخلہ نے بتایا کہ مدرسہ انتظامیہ کی رضامندی سے گرایا گیا اور متبادل عمارت 4 کروڑ روپے میں تعمیر کی گئی۔ (دی نیوز، ۱۱ اگست ۲۰۲۵ء)

۳. حکومت نے جمعیۃ علماء اسلام (ف) کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے مسجد دوبارہ تعمیر کرنے اور دیگر مساجد نہ گرانے کی یقین دہانی کرائی۔ (بزنس ریکارڈر، ۱۲ اگست ۲۰۲۵ء)

۴. مذہبی جماعتوں نے موقع پر جمعہ پڑھا اور ملبے سے علامتی تعمیر کی، پولیس کے ساتھ کشیدگی بھی ہوئی۔ (ڈان، ۱۶

اگست ۲۰۲۵ء)

۵. حکومت اور علماء ایکشن کمیٹی کے درمیان معاہدہ ہوا کہ مسجد اسی مقام پر چار ماہ میں دوبارہ تعمیر ہوگی، نمازوں کا انتظام اور مستقبل میں مشاورت پر بھی اتفاق کیا گیا۔ (ایکسپریس ٹریبیون، ۱۹ اگست ۲۰۲۵ء)

(رپورٹ — ۲۳ اگست ۲۰۲۵ء)

اسلام آباد انتظامیہ اور علماء ایکشن کمیٹی کے درمیان معاہدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج مورخہ 19 اگست 2025ء بروز منگل مدنی مسجد (راول ڈیم) چوک، اسلام آباد کے قضیہ کے معاملہ میں اسلام آباد انتظامیہ اور علماء ایکشن کمیٹی کے درمیان کامیاب مذاکرات کے بعد باہمی مشاورت سے طے پایا ہے کہ

۱. مدنی مسجد کی تعمیر سی ڈی اے چار ماہ میں مکمل کرے گی۔

۲. اس دورانیہ میں باہمی مشاورت سے مدنی مسجد کے مقام پر پانچ وقت باجماعت نماز کے لیے ترتیب بنائی جائے گی۔

۳. پچاس مساجد سے متعلق جو نوٹیفیکیشن جاری ہوا تھا وہ جعلی ہے، اس حوالے سے انتظامیہ نے کوئی لسٹ جاری نہیں کی، یہ محض افواہ ہے۔

۴. اسلام آباد میں آئندہ مساجد کے کسی بھی معاملہ میں انتظامیہ علماء ایکشن کمیٹی سے مشاورت کرے گی۔

دستخط — صاحبزادہ محمد یوسف، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، جنرل، اسلام آباد (نمائندہ ضلعی انتظامیہ)

دستخط — مفتی محمد اویس عزیز (نمائندہ علماء ایکشن کمیٹی، امیر جے یو آئی اسلام آباد)

دستخط گواہ — ڈاکٹر ضیاء الرحمان امازئی

دستخط گواہ — عبد الہادی (مجسٹریٹ، سیکرٹریٹ، اسلام آباد)

دستخط گواہ — محمد عثمان خان

مسجد گرانے کے متعلق چند اہم اُصولی سوالات

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

بعض پوسٹیں نظر سے گزریں جن میں مسجد گرانے کے فعل کی شدّ و مدّ سے تائید کی گئی تھی اور اس حکم کی تعمیل کو امیر کی اطاعت قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ زمین غصب کر کے مسجد بنائی گئی ہے۔

اس موقف پر چار اصولی سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱. حقیقی فرد/شخص (انسان) کی ملکیت اور فرضی شخص (ریاست) کی ملکیت کو یکساں کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

۲. اگر کسی حقیقی فرد کی ملکیت پر کسی اور نے مالکانہ تصرف کیا اور عشروں تک وہ خاموش رہا، تو کیا بعد میں وہ عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتا ہے؟

۳. کیا ریاست نے دعویٰ کیا بھی ہے؟

۴. ریاست کے کسی محکمے نے اگر ایسا دعویٰ کیا بھی ہو، تو کیا صرف اس کے دعوے پر ہی اسی محکمے کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ جس عمارت کو وہ ناجائز سمجھتا ہے، اسے راتوں رات گرا دے؟

پہلا سوال یہ معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کیا واقعی مذکورہ زمین کو غصب شدہ زمین کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ زمین کسی حقیقی فرد/افراد کی ملکیت تھی یا ریاست کی ملکیت تھی؟

اتنا تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ پہلا امکان نہیں ہے، اس لیے دوسرے امکان پر غور کریں۔

اگر آپ اسے ریاست کی ملکیت قرار دیتے ہیں، تو آگے بڑھنے سے قبل اس پر سوچیے کہ ریاست کیا ہے؟ ایک فرضی شخص؟ کیا اسلامی قانون کی رو سے فرضی شخص کا تصور قابلِ قبول ہے بھی، یا ویسے ہی آپ نے فرض کر لیا ہے کہ چونکہ یہ تصور رائج ہے تو بس جائز ہے؟ کیا اسلامی قانون کی رو سے ایسی زمین جو کسی حقیقی فرد کی ملکیت میں نہ ہو، ریاست نام کے فرضی شخص کی ملکیت میں شامل سمجھی جاتی ہے، یا اسے ”مباحات“ میں شمار کیا جاتا ہے، اور کیا ”مباح مال“ پر قبضے کو ”غصب“ کہا جاتا ہے؟

چلیں، ان مشکل سوالات سے جان چھڑانے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ اسلامی قانون کی رو سے فرضی شخص کا تصور قابلِ قبول ہے۔ لیکن یہیں سے تو وہ سوال اٹھا جو اوپر پہلے سوال کے طور پر ذکر ہوا ہے: حقیقی فرد (انسان) کی ملکیت اور فرضی شخص (ریاست) کی ملکیت کو یکساں کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہ سوال بھی مشکل ہے تو چلیں اس سے بھی جان چھڑانے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ دونوں کی ملکیت یکساں ہے اور مان لیتے ہیں کہ جس نے ریاست نامی فرضی شخص کی ملکیت پر اس کی اجازت کے بغیر قبضہ کیا، اس نے غلط کیا۔ یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا مالِ غیر منقول کو "غصب" کیا جا سکتا ہے؟ لیکن اس مشکل سوال کو بھی پیپر سے نکال لیتے ہیں کیونکہ پھر 'دانشور' احتجاج کریں گے۔ چنانچہ ہم اس پہلے سوال کے جواب میں فرض کر لیتے ہیں کہ ریاست کی زمین غصب کر لی گئی ہے اور ریاست کو حق ہے کہ غاصب کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے۔

اب یہاں سے وہ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا: جب آپ حقیقی فرد اور فرضی شخص کی ملکیت کو یکساں مانتے ہیں، تو اگر کسی حقیقی فرد کی ملکیت پر کسی اور نے مالکانہ تصرف کیا اور مالک عشروں تک خاموش رہا، تو کیا بعد میں وہ عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتا ہے؟ واضح رہے کہ یہاں بات اس کی نہیں ہو رہی کہ کیا مالک کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت میں تصرف کرنے والا اس مال کا مالک بن جاتا ہے، بلکہ اس کی ہو رہی ہے کہ کیا مالک کے پاس عدالتی چارہ جوئی کا حق ہے؟ یہاں اصل میں بات قانونِ تحدید میعادِ سماعت (Limitation Act) کی ہو رہی ہے۔

اب اگر آپ حقیقی فرد اور فرضی شخص کی ملکیت کو یکساں مانتے ہیں، تو اس سوال کا جواب واضح طور پر نفی میں ہے لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ریاست کے پاس چارہ جوئی کا حق ہے، تو آپ فرضی شخص کی ملکیت کو حقیقی فرد کی ملکیت سے زیادہ اہم اور زیادہ مقدس مانتے ہیں۔

گویا پہلے آپ نے ایک فرضی شخص گھڑا، پھر اس فرضی شخص کے لیے ملکیت فرض کی، پھر اس ملکیت کو حقیقی شخص کی ملکیت پر فوقیت بھی دے دی!

چلیں، بحث کی خاطر ہم آپ کے ساتھ یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ریاست نامی فرضی شخص کی ملکیت کو حقیقی فرد کی ملکیت پر فوقیت حاصل ہے اور اس وجہ سے قانونِ تحدیدِ سماعت کا اطلاق ریاستی املاک پر نہیں ہوتا اور یہ کہ ریاست جب چاہے دعویٰ دائر کر سکتی ہے، خواہ اس دوران میں وہ 40 سال تک خاموش رہی ہو۔

لیکن یہیں سے تو اوپر ذکر کردہ تیسرا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے: کیا ریاست نے دعویٰ کیا بھی ہے کہ اس کی ملکیت پر کسی اور نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے؟ اس وقت تو آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک محکمے کا موقف یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر غیر قانونی تھی۔

اگر گھوم پھر کر بالآخر آپ اصل مسئلے تک پہنچ ہی گئے ہیں، تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ریاست" کی جانب سے دعوے کا اختیار کس کے پاس ہے اور دعوے کے بعد مدعی اور دوسرے فریق کا موقف سننے اور پھر فیصلہ کرنے کا

اختیار کس کے پاس ہے؟ کیا یہاں صرف سرکاری رپورٹس پر انحصار کرنا کافی تھا یا دوسرے لوگوں کو بھی سننا چاہیے تھا، بالخصوص ان کو جن کے متعلق آپ کا الزام ہے کہ انھوں نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے؟ اور کیا فیصلے کا اختیار اسی محکمے کے پاس ہے جس نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کام غیر قانونی تھا؟ اور اگر یہ غیر قانونی تھا، تو اس غیر قانونی کام کو روکنا کس کی ذمہ داری تھی؟ کیا اسی محکمے کی؟ تو اس محکمے نے ان افراد کے خلاف کیا کارروائی کی جو اس غیر قانونی کام کو نہیں روک سکے اور کئی عشروں تک انھوں نے اس سے صرفِ نظر کیے رکھا؟

سوالات تو اور بھی ہیں، جیسے کسی مسجد کا شارعِ عام میں رکاوٹ بننے کی صورت وہاں سے ہٹا دینا اور کسی مسجد کو ہٹا کر اس کی جگہ درخت لگانا، کیا ایک ہی نوعیت کے کام ہیں؟ یا یہ کہ اس محکمے کی نظر صرف مسجدوں پر ہی کیوں پڑی ہے اور اسے شاہراہِ دستور اور اس کے ارد گرد بلند و بالا اور وسیع و عریض غیر قانونی عمارات کیوں نظر نہیں آ رہیں؟ لیکن ان پر بحث اگلے مرحلے میں ہو گی، ان شاء اللہ۔

facebook.com/share/p/19GUNGnjYK

مسجد گرانے کے متعلق سوالات کی مزید توضیح

کل مسجد گرانے کے حکم نامے کے پس منظر میں چند سوالات اٹھائے تھے لیکن بعد کی بحث سے معلوم ہوا کہ وہ سوالات بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکے۔ اس لیے ایک دفعہ پھر ان سوالات کی توضیح کر رہا ہوں تاکہ ان کے ذریعے جن امور کی طرف توجہ دلانی مقصود تھی، وہ امور سامنے آ جائیں۔

سوالات یہ تھے:

1. حقیقی فرد (انسان) کی ملکیت اور فرضی شخص (ریاست) کی ملکیت کو یکساں کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟
2. اگر کسی حقیقی فرد کی ملکیت پر کسی اور نے مالکانہ تصرف کیا اور عشروں تک وہ خاموش رہا، تو کیا بعد میں وہ عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتا ہے؟
3. کیا ریاست نے دعویٰ کیا بھی ہے؟

پہلے سوال کے اصل مخاطب وہ علمائے کرام تھے جنھوں نے فرضی شخصیت (Fictitious Personality) کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور قرار دیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ تصور اسلامی اصولوں کی رو سے جائز ہے، بلکہ اسلامی تراث میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ انھی علمائے کرام کو مخاطب کر کے یہ سوال قائم کیا گیا تھا تاکہ انھیں معلوم ہو کہ فرضی شخصیت ماننے کے بعد کون سے نتائج ماننے لازمی ہیں؟ ان نتائج میں ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ پھر "سب کی مشترک ملکیت" اور "مباحات کی ملکیت" جیسے تصورات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جب آپ نے فرض کر لیا کہ ریاست ایک شخص ہے تو اس فرضی

شخص کی ملکیت کو وہی قانونی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے جو کسی حقیقی شخص کی ملکیت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ مان لیا تو پھر یہ بھی ماننا ہو گا کہ اس فرضی شخص کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف اسی طرح ناجائز ہے، جیسے کسی حقیقی شخص کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ناجائز ہوتا ہے۔ یہ بھی مان لیا، تو پھر یہ بھی ماننا ہو گا کہ ریاست کی اجازت کے بغیر ریاستی ملکیت میں شامل زمین پر قبضہ کرنا غلط ہے، خواہ یہ قبضہ مسجد کی تعمیر کے لیے کیا جائے۔

اس کے بعد دوسرا سوال اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ بتایا جا سکے کہ معاصر قانونی نظام میں نہ صرف یہ کہ ریاست نامی فرضی شخص کو ملکیت کا حق اسی طرح دیا گیا ہے جیسے کسی حقیقی شخص کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ اس نظام میں اس فرضی شخص کی ملکیت کو حقیقی شخص کی ملکیت سے زیادہ تقدس عطا کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے اسے زیادہ تحفظ حاصل ہے۔ چنانچہ مثلاً اس ملکیت پر قانونِ تحدیدِ سماعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ریاست جب چاہے دعویٰ دائر کر سکتی ہے، خواہ اس دوران میں وہ 40 سال تک خاموش رہی ہو۔

یہیں سے تیسرا سوال پیدا ہوا تھا کہ چلیں، ریاست کسی بھی وقت دعویٰ کر سکتی ہے لیکن کیا موجودہ معاملے میں وہ مدعی ہے بھی؟ اس کے بعد میں نے واضح کیا تھا کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، لیکن اگر آپ سی ڈی اے کی رپورٹ کو ریاست کی جانب سے دعویٰ قرار بھی دیں، تو اس کے بعد وہ نیا سوال پیدا ہوتا ہے جو میں نے مضمون کے آخر میں ذکر کیا تھا لیکن کچھ معلوم اور بہت سی نامعلوم وجوہات کی بنا پر ناقدین نے اس سوال پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ سوال یہ تھا: "کیا یہاں صرف سرکاری رپورٹس پر انحصار کرنا کافی تھا یا دوسرے لوگوں کو بھی سننا چاہیے تھا، بالخصوص ان کو جن کے متعلق آپ کا الزام ہے کہ انھوں نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے؟ اور کیا فیصلے کا اختیار اسی محکمے کے پاس ہے جس نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کام غیر قانونی تھا؟ اور اگر یہ غیر قانونی تھا، تو اس غیر قانونی کام کو روکنا کس کی ذمہ داری تھی؟ کیا اسی محکمے کی؟ تو اس محکمے نے ان افراد کے خلاف کیا کارروائی کی جو اس غیر قانونی کام کو نہیں روک سکے اور کئی عشروں تک انھوں نے اس سے صرفِ نظر کیے رکھا؟"

مجھے حیرت ہے کہ اس پہلو پر بھی ناقدین کی توجہ کیوں نہیں ہو سکی؟ (اس حیرت کو بے شک آپ تجاہلِ عارفانہ کہہ دیں۔)

تو ناقدین کی آسانی کے لیے میں صورتِ مسئلہ آسان کر کے یوں پیش کر دیتا ہوں:

- مان لیا کہ ریاست نامی فرضی شخص کو ملکیت کا حق حاصل ہے؛
- مان لیا کہ ریاست نامی فرضی شخص کی ملکیت کسی حقیقی شخص کی ملکیت سے زیادہ مقدس اور محفوظ ہے اور اس وجہ سے اس پر قانونِ تحدیدِ سماعت کا اطلاق بھی نہیں ہوتا؛
- مان لیا کہ ریاست نے اپنی ملکیت پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کے خلاف دعویٰ بھی کیا ہے؛

لیکن یہ سب کچھ ماننے کے بعد سوال یہ ہے کہ دوسرے فریق کو پوری طرح سنے بغیر، جس پر غاصبانہ قبضے کا دعویٰ ہے، کیا مدعی خود ہی اپنے حق میں فیصلہ کرنے کا مُجاز تھا؟ سی ڈی اے کی کارروائی کو غلط قرار دینے کے لیے تنہا یہی سوال کافی ہے، اگرچہ پچھلے مضمون کے آخر میں اس سوال کا بھی اضافہ کیا گیا تھا: ”کسی مسجد کا شارعِ عام میں رکاوٹ بننے کی صورت وہاں سے ہٹا دینا اور کسی مسجد کو ہٹا کر درخت لگانا، کیا ایک ہی نوعیت کے کام ہیں؟“ یہ سوال اس لیے ضروری تھا کہ ناقدین اسلامی شریعت کا ناقص ہی سہی حوالہ دے رہے ہیں، تو پھر بات پوری کیوں نہ کی جائے؟

اب جب نیا مضمون لکھ ہی لیا ہے، تو ایک سوال کا مزید بھی اضافہ ہو جائے۔

جن معاصر علمائے کرام نے قرار دیا ہے کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں نہ صرف فرضی شخص کا تصور جائز ہے بلکہ اس کی مثالیں بھی اسلامی قانون میں ملتی ہیں، ان کے نزدیک مسجد، بلکہ وسیع مفہوم میں وقف، بھی فرضی شخص ہے۔ چنانچہ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرضی شخص ایک اور فرضی شخص کی ملکیت پر اس کی اجازت کے بغیر قبضہ کرلے، تو اس مسئلے سے کیسے نمٹا جائے گا؟ کیا بڑا فرضی شخص (ریاست) چھوٹے فرضی شخص (مسجد) کو قتل کرلے گا؟

نوٹ: جو لوگ مسجد گرانے کے لیے ”شہید کرنے“ کی ترکیب استعمال کرتے ہیں، یہ محض شاعرانہ استعارہ ہے۔ اس کا قانون کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں ہے، لیکن مسجد یا ریاست کو شخص ماننا محض شاعرانہ استعارہ نہیں، بلکہ قانونی اصول ہے اور اس کے قانونی اثرات ہوتے ہیں۔ کاش کوئی سمجھے!

facebook.com/share/p/1LnT8L7im7

ریاست کی ملکیت نہیں، تو لوٹ ہی مچ جائے گی؟

ایک تو ہمارے اہلِ دانش کا بھی عجیب مسئلہ ہے۔ جس صندوق میں ان کے ذہنوں کو اغیار نے بند کر دیا ہے، اس سے باہر نکل کر سوچنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔

تازہ مثال مسجد کے انہدام کی ہے، وہ مسجد جس کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ یہ قبضہ شدہ زمین پر تعمیر کی گئی تھی۔

ان سے پوچھا کہ قبضہ شدہ زمین کیسے آپ کہہ سکتے ہیں، کیا یہ زمین کسی کی ملکیت تھی؟

جواب ملا، ریاست کی ملکیت تھی۔

پوچھا، کیا ریاست بھی مالک ہو سکتی ہے؟

کہا، ہاں، کیوں نہیں؟

پوچھا، کیا ریاست شخص ہے؟

کہا، ہاں، کیوں نہیں؟

پوچھا، کیا اسلامی شریعت میں ایسے فرضی شخص کا کوئی تصور پایا جاتا ہے؟

اب کے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، اور پنجے جھاڑ کر، جھپٹ پڑے: ریاست کی ملکیت کا انکار کریں گے، تو لوٹ ہی مچ جائے گی، پھر تو ہر کوئی اپنی مرضی سے یہ کرے گا، وہ کرے گا، پھر تو تاجروں اور دکانداروں کی "تجاوزات" بھی جائز ہو جائیں گی، وغیرہ وغیرہ۔

یہ اہلِ دانش ایسا کہتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس قیامت کا منظر آپ پیش کر رہے ہیں، وہ قیامت آخر کیوں آئے گی؟ ریاست کے لیے فرضی شخصیت اور اس فرضی شخصیت کے لیے حقِ ملکیت مانے بغیر صدیوں تک آپ کا نظام کیسے چلتا رہا؟ اب کیوں نہیں چل سکتا؟ مجال ہے کہ یہ اہلِ دانش آقاؤں کے دیے گئے صندوق سے باہر نکل سوچنے کی جرات کر سکیں۔

بہر حال، جو لوگ سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے مختصر اشارات پیش ہیں:

ایک یہ کہ جو زمین کسی کی ملکیت نہیں، وہ "مباحات" میں ہے۔ ان مباحات پر جس نے پہلے تسلط حاصل کیا، یہ اس کی ہو جائیں گی، لیکن حکومت عوام کے وکیل اور ولی کی حیثیت سے ان مباحات کے استعمال کو مقیّد کر سکتی ہے اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ قانون سازی کر سکتی ہے جس کی پابندی حکومت سمیت سب پر لازم ہوگی، بشرطے کہ اس قانون میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو شریعت سے متصادم ہو۔

اگر حکومت نے ایسی کوئی قانون سازی کی جس کے ذریعے مباحات میں شامل زمینوں کو اپنے تسلط میں لے لیا، تو وہ ریاست نامی فرضی شخص کی ملکیت میں نہیں ہوں گی، بلکہ تمام لوگوں کی مشترک ملکیت میں ہوں گی۔ اس سے نتائج پر کیا قانونی اثرات مرتب ہوں گے، ان پر خود ہی غور کیجیے۔

یہ امر البتہ طے شدہ ہے کہ جو احکام فرد کی ملکیت کے لیے ہیں، وہی احکام تمام لوگوں کی ایسی مشترک ملکیت کے لیے بھی ہوں گے اور "ریاست نامی شخص" کو اختصاصی فوقیت حاصل نہیں ہوگی۔

اگر حکومت نے قانون سازی کے ذریعے ایسی زمینوں کو مشترک ملکیت قرار نہیں دیا، تو یہ مباحات کے حکم میں ہی رہیں گی اور ان کے لیے وہی حکم ہوگا جو اوپر مباحات کے لیے ذکر کیا گیا۔

تاہم حکومت ایک درمیانی راہ بھی نکال سکتی ہے، اور وہ یہ کہ ان کو اپنے تسلط میں لیے بغیر، انھیں مباحات کے دائرے میں چھوڑتے ہوئے، ان کے استعمال کے حق پر اسلامی شریعت کی حدود کے اندر کچھ قیود لگا دے۔ اس پہلو پر یہ اہلِ دانش غور کریں، تو ان کے چودہ طبق روشن ہو سکتے ہیں۔

facebook.com/share/p/1Eoy86Brzu

اسلام کا خاندانی نظام اور عصرِ حاضر (1)

خطبہ نمبر2: مؤرخہ 28 ستمبر 2016ء

حضرات محترم! یہ نشستیں جن کا اہتمام جامعہ فتحیہ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان میں اس سال گفتگو کے لیے عمومی موضوع یہ منتخب کیا گیا ہے کہ قرآن پاک کے معاشرتی احکام کیا ہیں؟ سوسائٹی کے لیے، سماج کے لیے، معاشرے کے لیے، قرآن پاک کیا احکام، ضوابط اور قواعد ارشاد فرماتا ہے؟ لیکن میں پہلے مرحلے میں یہ بیان کرنا چاہوں گا کہ خاندانی نظام (Family System) کے حوالے سے قرآن پاک ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے۔

انسانی سوسائٹی کا آغاز فیملی سسٹم (خاندان) سے ہوا

اس لیے کہ دنیا میں انسانی سوسائٹی کا آغاز جوڑے سے ہوا، خاندان سے ہوا۔ اللہ رب العزت نے جہاں نسلِ انسانی کے آغاز کی بات کی وہاں ایک جملہ ارشاد فرمایا:

خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء

(سورۃ النساء:4، آیت:1)

(تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیے۔)

پوری انسانی سوسائٹی اسی جوڑے کی برکت سے ہے۔ جو سب سے پہلے جنت سے زمین پر اتارا گیا۔ انسانی سوسائٹی کا آغاز جوڑے سے ہوا ہے، یہ فیملی ہر زمانے اور ہر قوم میں رہی ہے، ہر مذہب میں رہی ہے، بغیر مذہب والوں کی بھی فیملی

رہی ہے اور اب تک چلی آرہی ہے۔

فیملی سسٹم کے چار دائرے

پہلا دائرہ: فیملی کیا ہے؟ فیملی کے احکام کیا ہیں؟ قوانین کیا ہیں؟ ہر ملک، ہر قوم اور ہر مذہب کے اپنے اپنے ضابطے اور قوانین ہیں، اسلام کے اپنے ضابطے ہیں۔ اس حوالے سے بات آگے چلانے سے پہلے یہ عرض کروں گا کہ خاندانی نظام (Family System) سے متعلقہ قوانین کو آج کل کی اصطلاح میں خاندانی قوانین (Personal Laws) کہتے ہیں۔ آج قانونی اصطلاح میں پبلک لاء ہے، پرسنل لاء ہے، فوجداری قانون ہے، دیوانی قانون ہے، یہ دائروں میں تقسیم ہیں۔ تو ان قانونی دائروں کی تقسیم میں فیملی کے لیے اصطلاح پرسنل لاء کی ہے۔ ان متعلقہ قوانین و احکام کو پرسنل لاء کہا جاتا ہے۔

دوسرا دائرہ: اس میں تین چار بنیادی باتیں ہیں: نکاح کیا ہوتا ہے؟ نکاح کی تعریف کیا ہے؟ نکاح کے احکام وضوابط کیا ہیں؟ نکاح کے بعد طلاق کیا چیز ہے؟ طلاق کے احکام اور اس کے مختلف دائرے کیا ہیں؟

تیسرا دائرہ: اولاد اور ماں باپ کے حقوق کیا ہیں؟ ماں باپ پر اولاد کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ اور اولاد پر ماں باپ کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟

چوتھا دائرہ: ماں باپ اور اولاد میں سے کوئی فوت ہو جائے تو وراثت کیسے تقسیم ہو گی؟ یہ چار بڑے دائرے ہیں۔ ان سے متعلقہ قوانین کو (Personal Laws) یعنی خاندانی قوانین کہا جاتا ہے۔

دورِ جاہلیت اور ”روشنی کے دور“ کی حدِ فاصل

نکاح مرد اور عورت کا وہ جائز ملاپ ہے جس کے نتیجے میں اولاد ہوتی ہے اور خاندان تشکیل پاتا ہے۔ اس کی تھوڑی سی وضاحت کے لیے میں یوں عرض کروں گا: خاتم النبیین ﷺ کے زمانے سے پہلے کا دور، جسے ہم ”دورِ جاہلیت“ کہتے ہیں، یہ ہماری تقسیم ہے۔ ہمارے ہاں نبی پاک ﷺ کی بعثت اور تشریف آوری سے پہلے کا زمانہ کیا کہلاتا ہے؟ ہم تو اس کو دورِ جاہلیت کہتے ہیں۔ رسول ﷺ سے پہلے کی جو کوئی بات ہوتی ہے اس کو دورِ جاہلیت کہتے ہیں اور حضور ﷺ کے بعد دورِ علم کی بات ہوتی ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ آج کے عالمی فلسفہ میں، آج کی تہذیب میں انقلاب فرانس 1789ء سے پہلے کے دور کو تاریکی کا دور (Dark Ages) اور بعد کے دور کو روشنی کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ اُن کی تقسیم ہے اور وہ ہماری تقسیم رہی ہے۔ ہمارے ہاں ایک دورِ جاہلیت اور دوسرا دورِ اسلام ہے۔ اور درمیان میں حدِ فاصل جناب نبی اکرم ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ سے پہلے جاہلیت کا دور اور حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اسلام کا دور کہلاتا ہے۔ جب بھی حوالہ دیں گے تو ان ادوار کے حوالے سے دیں گے کہ یہ جاہلیت کے دور کی بات ہے اور یہ اسلام کے دور کی بات ہے اور یہ تقسیم ہمارے ذہنوں میں رچ بس گئی ہے۔

بالکل اسی طرز پر مغربی دنیا میں بھی ایسی ہی تقسیم ہے۔ فرانس میں 1789ء کو انقلاب آیا تھا۔ اب اس کو سوا دو سو سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ پھر یہ انقلاب پھیلتے پھیلتے پورے یورپ میں پھیلا، اس وقت سے بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت ختم ہوئی۔ سوسائٹی میں نئے دور کا آغاز اس بنیاد پر ہوا کہ اب ہم خود فیصلہ کریں گے۔ خدا سے، رسول سے، کتاب سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یہ 1789ء تھا اور اب 2016ء ہے تو اس طرح اس انقلاب کو تقریباً سوا دو سو سال ہو گئے ہیں۔

مغربی دنیا میں آپ اگر کسی سے اس دور کی بات پوچھیں گے تو کہے گا ظلمت کے دور کی بات ہے، تاریکی کے دور کی بات ہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد روشن خیالی کے دور کی بات ہے۔ تو یہ اُن کی تقسیم ہے، پہلی بات تاریک زمانوں کی ہے۔ حتیٰ کہ آپ بھی جب دنیا میں قرآن کے حوالے سے، شریعت کے حوالے سے، سنت کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور خلافتِ راشدہ کی بات کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی سنت کی یا معاشرتی قوانین کی بات کرتے ہیں۔ تو پہلا جملہ یہ سننے کو ملتا ہے یہ "تاریک دور" (Dark Edge) کی بات ہے۔ یہ دنیا کو واپس تاریکی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ہم دنیا کو روشنی کی طرف لا رہے ہیں، یہ معاملہ الٹا کر رہے ہیں، واپس تاریک دور کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بس اس طرح سمجھیے مغرب میں روشن خیالی کی بات ہوتی ہے تو کون سا دور مراد ہوتا ہے؟ انقلابِ فرانس کے بعد کا۔ اس میں روشنی ہے یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ اور اس سے پہلے ان کے لیے تاریکیوں کا دور، ظلمتوں کا دور، جہالت کا دور ہے۔

ہمارے ہاں تقسیم دوسری ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے پہلے کا دور کیا کہلاتا ہے؟ جاہلیت کا دور۔ اور حضور ﷺ سے جس نئے دور کا آغاز ہوا وہ کون سا دور کہلاتا ہے؟ اسلام کا دور۔ یہ بات خود نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمائی ہے۔ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ ایک خطبہ نہیں تھا بلکہ کئی خطبے تھے۔ منیٰ میں کھڑے ہو کر ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: "كل امر الجاهلية موضوع تحت قدمی": (آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں)۔ یہ خطبہ حجۃ الوداع کا تاریخی جملہ ہے اور یہ بہت بڑی بات بلکہ مین پوائنٹ یہی ہے۔ اور یہیں سے تاریخ اپنا رخ بدل دیتی ہے۔

كل امر الجاهلية موضوع تحت قدمی (صحیح مسلم، باب حجۃ النبی ﷺ، حدیث نمبر 1218)

(جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔)

آج کے دن جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا میں جاہلیت کی ساری قدروں کو پاؤں کے نیچے روند کر انسانیت کو علم، روشنی اور نور کے دور کی طرف لے جا رہا ہوں۔

دورِ جاہلیت کے طریقۂ نکاح میں نبی اکرم ﷺ کی اصلاحات

میں نے یہ فرق اس لیے واضح کیا تاکہ یہ بتاؤں کہ جناب خاتم النبیین ﷺ نے نکاح کے حوالے سے جاہلیت کی کون سی قدریں ختم کی تھیں اور کون سی نئی چیز میں داخل کی تھیں۔ نکاح تو جاہلیت کے زمانے میں بھی تھا، خاندان بھی تھا، بچے بھی ہوتے تھے، میاں بیوی بھی ہوتے تھے، ان میں طلاق بھی ہوتی تھی، سب کچھ ہوتا تھا۔ خاتم النبیین ﷺ نے جاہلیت کے خاندانی نظام میں کیا اصلاحات کیں؟ پہلے کیا تھا اور آپ ﷺ نے کیا کیا؟ پہلے مرحلے میں نبی اکرم ﷺ نے جاہلیت کے فیملی سسٹم (خاندانی نظام) میں کیا تبدیلیاں کیں۔ اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کا عالمی فلسفہ خاندانی نظام میں کیا تبدیلیاں چاہتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں رائج نکاح کی مختلف صورتیں

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی تشریح فرماتی ہیں:

(صحیح بخاری کی طویل روایت ہے: عروة بن الزبير، ان عائشة، زوج النبی اخبرته ان النكاح فی الجاهلية كان على اربعة انحاء ...الخ۔ (صحیح بخاری، باب من قال لانکاح الابولی، حدیث نمبر 5127))

جاہلیت کے دور کے مرد اور عورت کے جو تعلقات ہوتے تھے، جن کو نکاح سے تعبیر کیا جاتا تھا، کون سے تعلق کو جائز سمجھا جاتا تھا، جس کو نکاح سمجھا جاتا تھا اور جس کے نتیجے میں ہونے والی اولاد کا نسب ثابت ہوتا تھا؟ اس زمانے میں یہ قانون تھا کہ کوئی بھی مرد اور عورت اگر رضامند ہیں تو یہ زنا کی ایک جائز صورت سمجھی جاتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: جاہلیت کے زمانے میں جو طریقے رائج تھے اور جو جائز سمجھے جاتے تھے، ان میں ایک طریقہ تو یہی تھا جو ہمارے ہاں ہے کہ مرد عورت ایک معاہدے کے تحت زندگی بھر کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اعلان کر دیا کہ ہم میاں بیوی ہیں اور زندگی بھر کے لیے یہ نکاح کافی ہے۔ اس کے علاوہ بھی تین چار صورتیں تھیں۔

متعدد افراد سے تعلق: ایک عورت کا بیک وقت آٹھ نو اور دس افراد سے تعلق ہوتا تھا، یہ سب کی مشترکہ بیوی ہوتی تھی۔ سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس عورت کا تعلق اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے، سوسائٹی بھی جانتی تھی۔ جب بچہ پیدا ہوتا تھا تو اس بارے میں قانون کیا تھا، ضابطہ کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ عورت ان میں سے کسی ایک کو بلاتی تھی اور کہتی کہ یہ بچہ تمھارا ہے اور اس متعلقہ مرد کو تسلیم کرنا پڑتا تھا وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری یہ صورت ہوتی تھی کہ تعداد کی کوئی تعیین نہیں تھی۔ دروازے پر جھنڈا لگا ہوتا تھا، یہ خاص قسم کی علامت ہوتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ جس کا جی چاہے وہ آجائے۔ اس میں مردوں کی کوئی تعداد متعیّن نہیں، نہ دس کی، نہ بیس کی، نہ چالیس کی۔ اس زمانے میں یہ جائز صورت سمجھی جاتی تھی۔ اور آج بھی مغرب میں جنسی مزدور (Sex Workers) کے طور پر جائز ہی سمجھی جاتی ہے۔ اصطلاح بدل گئی ہے۔ پہلے طوائف کہا جاتا تھا، اب سیکس ورکرز کہلاتی ہیں۔

عہدِ جاہلیت میں جب اس قسم کے نکاح کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوتا تو یہ سوال کہ اس کے نسب کا کیا کریں؟ وہ خاتون اندازے سے لوگوں کو بلاتی تھی اور قیافہ شناس آتا تھا۔ اسے آپ آج کا ڈی این اے ٹیسٹ سمجھ لیں۔ اس زمانے میں یہ کام قیافہ شناس کرتا تھا۔ وہ بچے کا ناک نقشہ دیکھ کر فیصلہ کرتا تھا کہ یہ بچہ اس مرد کا ہے۔ اور اس شخص کو یہ بچہ قبول کرنا پڑتا تھا، وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجلس میں جرگے میں پنچایت میں یہ قیافہ شناس جس کے نقش و نگار دیکھ کر کہتا کہ یہ بچہ اس کا ہے، اس کو ماننا پڑتا کہ یہ بچہ میرا ہے، اس طرح سے نسب ثابت ہوتا تھا۔

نکاحِ استبضاع: ایک نکاح کی صورت یہ تھی کہ میاں بیوی آپس میں رضامندی سے فیصلہ کرتے تھے کہ کسی اچھے خاندان کا بیج حاصل کرتا ہے، نسل حاصل کرنی ہے۔ جیسے نسل حاصل کرنے کے لیے گائے کو بھیجتے ہیں، تو میاں بیوی کی رضا مندی (Understanding) سے خاتون کسی اچھے خاندان میں جاتی تھی اور اس وقت تک وہاں رہتی تھی جب تک اسے حمل نہ ہو جائے۔ دونوں میاں بیوی راضی ہیں انڈرسٹینڈنگ ہے، جب وہ بات مکمل ہو جاتی تو واپس آجاتی تھی، وہ بچہ اس کا سمجھا جاتا تھا اور مقصد پیچھے یہ ہوتا تھا کہ بہادر ہے، شاعر ہے، یہ ہے، وہ ہے۔ یہ بھی نکاح کا طریقہ تھا جو سوسائٹی میں جائز سمجھا جاتا تھا۔

نکاحِ مؤقت: ایک یہ صورت تھی کہ وقت طے کر کے نکاح کرنا، دو مہینے کے لیے، چھ مہینے کے لیے، سال دو سال، پانچ سال کے لیے۔ وہ دو گھنٹے ہوں یا بیس سال، وہ نکاح مؤقت ہے۔ اسلام نے باقاعدہ نکاح، یعنی زندگی بھر کا معاہدہ، صرف اسی صورت کو جائز رکھا۔ باقی نکاح مؤقت، نکاح استبضاع، بدکاری وغیرہ ساری صورتیں منع فرما دیں۔ بس آج سے یہ نکاح ہوگا اس کے علاوہ کسی کو نکاح نہیں سمجھا جائے گا۔ اور قرآن پاک نے اس کا اعلان فرما دیا:

والذین ہم لفروجہم حٰفظون، الا علیٰ ازواجہم او ما ملکت ایمانہم فانہم غیر ملومین (سورۃ المومنون: 23، آیت: 5، 6)

(اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں کیونکہ ایسے لوگ قابلِ ملامت نہیں ہیں)

قرآن نے اس کا اعلان کیا، باقاعدہ زندگی بھر کی بیوی ہوگی۔ اور رہی لونڈی، تو لونڈی کی بات میں اپنے مقام پر کروں گا کہ لونڈی کیا چیز ہے، مگر یہاں نکاح کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ نکاح میں قرآن پاک نے بھی کیا ہے۔

والذین ہم لفروجہم حٰفظون (سورۃ المومنون: 23، آیت: 5)

(اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں۔)

کہ ایمان والوں کا وصف یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یا باقاعدہ بیویاں ہوں یا لونڈیاں بس۔

فمن ابتغٰی وراء ذٰلک فاولئک ہم العٰدون (سورۃ المومنون: 23، آیت: 7)

(ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔)

اس کے علاوہ کوئی جو بھی صورت اختیار کرے گا وہ گناہ کی ہے، تو نکاح کے جو بھی دوسرے طریقے جاہلیت میں رائج سمجھے جاتے تھے وہ حضور ﷺ نے منع فرما دیے۔

پہلی اصلاح، زنا سببِ نسب نہیں

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ (بخاری شریف کی بڑی تفصیلی روایت ہے) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بھائی نے وصیت کی تھی وہ لڑکا جو فلاں کے گھر میں پیدا ہوا وہ میرا ہے۔ جب تمھیں موقع ملے اسے قابو کر لینا۔ فتح مکہ کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو موقع ملا انھوں نے اسے قابو کر لیا۔ فرمایا یہ میرا بھتیجا ہے۔ وہ ام المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے باپ کی لونڈی سے تھا۔ اس رشتے سے وہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھائی لگتا تھا۔ جبکہ دوسرے دعوے سے وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بھتیجا لگتا تھا۔ دونوں کا جھگڑا ہو گیا۔

جو بات میں کہنے لگا ہوں وہ یہ ہے، کوئی آدمی دعویٰ کر دیتا کہ فلاں عورت کے گھر میں جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ میرا ہے۔ اور عورت تصدیق کر دیتی تو بچہ اس کا شمار ہوتا تھا۔ میرے خیال میں ڈی این اے ٹیسٹ کی صورت میں آج بھی مغرب میں یہی طریقہ ہے۔ نبی پاک ﷺ نے یہ سلسلہ ختم کیا اور بنیادی قاعدہ بیان کیا۔ جو اصول کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا:

الولد للفراش وللعاھر الحجر (صحیح بخاری، باب من قضیٰ بحق اخیہ، حدیث نمبر: 7182)

(بچہ شوہر کا ہوگا اور زانی کے لیے پتھر ہے۔)

زنا سے نسب ثابت نہیں ہوگا اور زانی کو پتھر پڑیں گے۔ نسب اس سے ثابت ہوگا جس کے بستر پر بچہ ہے۔ اس کا قانونی زبان میں ترجمہ کرتا ہوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ زنا آج کے بعد نسب کا سبب نہیں ہوگا۔ جب (کہ) زمانہ جاہلیت میں زنا نسب کا سبب سمجھا جاتا تھا۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ اور صاف اعلان کر دیا: ”الولد للفراش وللعاھر الحجر“ نسب اس سے ثابت ہوگا جس کے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور کوئی زنا کا دعویٰ کرے گا تو اس کو نسب نہیں ملے گا، اس کو پتھر ملیں گے، سنگسار کر دیا جائے گا۔ حضور ﷺ نے نسب کے ثبوت کو واضح کر دیا کہ اگر زنا ثابت بھی ہو جائے تب بھی نسب کسی طرح ثابت نہیں ہوگا۔ تو بنیادی اعلان حضور ﷺ نے یہ کیا کہ زنا آج کے بعد نسب کے ثبوت کا سبب تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

دوسری اصلاح، بیویوں کی تحدید

جناب خاتم النبیین ﷺ نے ایک تبدیلی یہ کی جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جاہلیت کے زمانے میں بیویوں کی تعداد کے بارے میں کوئی پابندی نہیں تھی۔ دس دس، پچاس پچاس، سو سو، کوئی حد نہیں تھی۔ طاقتور آدمی، مالدار آدمی جتنی مرضی چاہے کرلے، کوئی پرسان حال نہیں۔ لطف کی بات یہ کہ ایسی اکثر روایات کی راویہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ان کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ پوچھا کہ اماں جان قرآن کی ایک آیت سمجھ نہیں آرہی۔

(عروة بن الزبير، انه سال عائشة رضى الله عنها، عن قول الله تعالىٰ: وان خفتم الا تقسطوا۔ (صحیح بخاری، باب باب شرکۃ الیتیم واہل المیراث، حدیث نمبر: 2494))

قرآن پاک کی بہت سی آیات لوگوں کو بظاہر سمجھ نہیں آتی تھیں تو بڑوں سے رجوع کرتے تھے۔ اماں جان سے ان کی قرآن فہمی کی وجہ سے زیادہ رجوع ہوتا تھا۔ ان کے بھانجے نے کہا: اماں جان مجھے آیت سمجھ نہیں آئی۔ قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

وان خفتم الا تقسطوا فى اليتٰمى فانكحوا ما طاب لكم من النسآء مثنٰى وثلٰث وربٰع (سورۃ النساء: 4، آیت: 3)

(اگر تمھیں خوف ہو کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے پھر شادیاں کرو جو عورتیں اچھی لگیں دو سے تین سے چار سے۔)

سوال یہ کیا ہے: یتیموں سے انصاف نہ کرسکو تو شادیاں کرو، اس کا کیا مطلب ہے؟ اماں جان دونوں جملوں کا جوڑ سمجھ نہیں آتا کہ اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں سے انصاف نہیں کرسکو گے تو پھر دو شادیاں کرو، تین کرو، چار کرو۔ کیا مطلب ہے اس کا؟ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تمام تر پس منظر بیان کیا تب حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو بات مکمل طور پر سمجھ آئی۔

قرآن پاک کی بیسیوں ایسی آیات ہیں جب تک آپ اس کا پس منظر نہیں سمجھیں گے آیت سمجھ نہیں آئے گی۔ ہماری زبان میں پس منظر (Background) ہے اور مفسرین کی اصطلاح میں ہے ''شانِ نزول''۔ ان میں سے ایک یہ آیت بھی ہے جو حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو سمجھ میں نہیں آئی۔ اماں جان نے فرمایا: بیٹا اس کا ایک خاص پس منظر ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں قبائلی سسٹم تھا، برادریاں اور قبیلے تھے۔ قبیلوں کا یہ سسٹم تھا کہ کوئی بچی یتیم ہو جاتی تھی جو خوبصورت ہے یا مال دار ہے، قبیلے کا سردار یہ چاہتا تھا یہ باہر نہیں جانی چاہیے۔ اس کی یا تو وجہ مال ہوتی تھی یا حسن۔ لڑکی خوبصورت ہے تو وہ کہہ دیتا میری بیوی ہے، سردار کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ یہ جاہلیت کے کلچر کی ایک تصویر ہے۔ سرداری

نظام تھا، قبائلی سسٹم تھا۔ لڑکی کا باپ فوت ہو گیا، وہ یتیم ہو گئی ہے، خوبصورت ہے، تب سردار کی نیت خراب ہو گئی، بس یہ اس کی بیوی ہے، خرچہ ورچہ نہیں دیتے تھے، مال ہڑپ کرتے تھے، اور تعداد کی پابندی نہیں تھی اپنا اختیار سمجھا جاتا تھا۔

اللہ پاک نے یہ حکم اس جاہلیت کی رسم کو توڑنے کے لیے نازل کیا، دو باتیں نازل کیں: ایک یہ کہ یتیم بچی کو گھر میں داخل کر کے انصاف نہیں کر سکتے تو اس کو چھوڑ دو اور آزاد عورتیں تلاش کرو تاکہ تمھیں کوئی پوچھنے والا ہو۔ ایک پابندی یہ لگائی کہ لڑکی یتیم ہے اور تمھارا شادی کا ارادہ بنتا ہے تو کرو لیکن شرط کیا ہے؟ اگر ان کے حقوق پورے نہیں کر سکتے، ان کا خرچہ پورا نہیں کر سکتے، انصاف فراہم نہیں کر سکتے، تو یتیم بچی کو خراب نہ کرو۔ آزاد عورتوں سے نکاح کرو تاکہ کوئی پیچھے پوچھنے والا تو ہو کہ میاں کیا کر رہے ہو؟ یہ بھی بڑی حکمت ہے۔ ان غریبوں کو پیچھے کون پوچھے گا؟

یہاں ایک تجزیے کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ خاندان کے سسٹم میں اسلام نے اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ لڑکی کو نکاح میں لائے ہیں تو اس کے پیچھے پوچھنے والے بھی ہونے چاہئیں۔ ہماری بہن کس حال میں ہے؟ ہماری بیٹی کس حال میں ہے؟ اور اگر کوئی زیادتی کی ہے تو پوچھ سکیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ صاحبِ ہدایہ نے مسئلہ بیان کیا ہے کہ میاں بیوی جن کا نکاح ہوا ہے۔ جہاں میاں رہے گا وہاں بیوی بھی رہے گی۔ لیکن کوئی خاوند اپنی بیوی کو اس کے خاندان سے اتنی دور نہیں لے جا سکتا کہ میل ملاپ کے واسطے ہی ختم ہو جائیں۔ "لان الغریبة توذیٰ" (ہدایہ، باب المہر، ج ا، ص 206) (مسافر عورت کو اذیت دی جائے گی) کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا، یہ پوچھنا بھی ایک حق ہے۔ اتنا دور نہیں لے جا سکتا کہ ماں باپ کے ساتھ میل جول کے اسباب ہی ختم ہو جائیں۔ وجہ کیا بیان کی "لان الغریبة توذیٰ" مسافر عورت کو اذیت دی جائے گی اور پوچھنے والا کوئی ہو گا نہیں۔ تو قرآن پاک نے کہا کہ نکاح آزاد عورتوں سے کرو، دو ہوں، تین ہوں، چار ہوں، لیکن کسی کو تنگ نہ کرو، اس کی بے بسی سے فائدہ مت اٹھاؤ۔

چار بیویوں تک مشروط اجازت ہے

دوسری پابندی یہ لگا دی کہ چار سے زیادہ نہیں، یہ چار کی پابندی ہے، چار کا حکم نہیں ہے۔ چار سے زیادہ کی ممانعت ہے کہ زیادہ سے زیادہ چار کر سکتے ہو اگر کرنا چاہو۔ یہ امتدادِ حکم کے لیے نہیں، یہ اسقاط ماوراء کے لیے ہے۔ یہ زیادہ (Maximum) کی حد ہے، کم (Minimum) کی نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قرآن پاک نے پابندی لگا دی۔ چار سے زیادہ کی ممانعت کے لیے اور یتیم بچیوں کو ظلم سے بچانے کے لیے۔ اور یہ جاہلیت کے نظام میں تبدیلی تھی کہ چار سے زیادہ نہیں۔ اور چار بھی مشروط ہیں، ایک سے زیادہ کی اجازت ہے لیکن مشروط ہے۔ "فان خفتم الا تعدلوا فواحدة" (سورۃ النساء: 4، آیت: 3) اگر تمھیں ڈر ہو کہ میں انصاف نہیں کر سکوں گا تو پھر ایک پر ہی گزارا کرو۔ ایک سے زیادہ کی اجازت انصاف اور عدل کی شرط پر ہے۔ ایک سے زیادہ میں انصاف کرنا ویسے بھی مشکل کام ہوتا ہے۔

آپ ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد پر وارد اعتراض اور اس کا جواب

جناب نبی اکرم ﷺ کے پاس بیک وقت نو بیویاں تھیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ حضور ﷺ پر ہونے والے اعتراضات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب چار کی پابندی لگی تو باقی سب سے حضور ﷺ نے زائد بیویاں چھڑوا دیں کہ چار سے زائد بیویوں کو چھوڑ دو اور خود کیوں نہیں چھوڑیں؟ نو بیویاں آخری وقت تک تھیں۔ یہ مغرب کے اعتراضات میں سے ایک بڑا اعتراض ہے کہ خود کیوں نہیں چھوڑیں باقیوں سے چھڑوا دیں؟ آسان سی بات عرض کر دیتا ہوں۔ باقیوں نے جو چھوڑیں ان کا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ بن گیا۔ حضور ﷺ کی بیویوں کو قرآن پاک نے کہا کہ ”وازواجه امهٰتهم“ (سورۃ الاحزاب: 33، آیت 26) کہ نبی کی بیویاں تمہاری مائیں ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ان میں سے کسی کے ساتھ کسی کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ”ولا ان تنكحوا ازواجه من بعده ابدا“ (سورۃ الاحزاب: 33، آیت: 53) تو یہ پانچ کدھر جاتیں؟ تو ان کے مقام و مرتبے (Status) کا تقاضا یہ تھا، ان کے احترام کا تقاضا یہ تھا۔ فرمایا: ”لا يحل لك النسآء من بعد“ ان کے بعد نئی کی اجازت نہیں ہے۔ باقیوں کے لیے چار کے بعد نہیں، آپ ﷺ کے لیے نو کے بعد نہیں۔ نئی شادی آپ ﷺ نہیں کر سکتے۔ ”لا يحل لك النساء من بعد ولا ان تبدل بهن من“ (سورۃ الاحزاب: 33، آیت 52) اور پھر حضور ﷺ پر یہ پابندی بھی لگی کہ ان میں سے کوئی تبدیل بھی نہیں کر سکتے، یعنی ان کو چھوڑ کر کسی اور سے نکاح کر لیں۔ یہ پانچ جن کو چھوڑنا تھا وہ کدھر جاتیں؟ وہ تو امت کی مائیں ہیں۔ ان کے احترام کا تقاضا تھا، ان کے پروٹوکول کا تقاضا تھا کہ یہ نو کی نو رہیں اور اسی نبوی نسبت کی شان سے رہیں۔

میں نے یہ عرض کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قرآن پاک نے چار سے زیادہ پر پابندی لگا دی کہ بیک وقت چار سے زیادہ نکاح نہیں کر سکتے۔ ایک بنیادی تبدیلی قرآن پاک نے یہ کی۔

تیسری اور چوتھی اصلاح، نکاح میں اعلان اور نان نفقہ کی ذمہ داری

ایک اور تبدیلی کی جاہلیت کے نظام میں کہ جہاں نکاح کا ذکر کیا ہے وہاں دو تین شرطیں رکھی ہیں۔ اس کا میں اپنی زبان میں ترجمہ کیا کرتا ہوں۔ فرمایا کہ:

فما استمتعتم به منهن فاٰتوهن اجورهن (سورۃ النساء: 4، آیت: 24)

(چنانچہ جن عورتوں سے (نکاح کر کے) تم نے لطف اٹھایا ہو، ان کو ان کا وہ مہر ادا کرو جو مقرر کیا گیا ہو۔)

قرآن پاک نے مالی ذمہ داریاں قبول کرنے کا کہا۔ مالی ذمہ داریوں کے بغیر نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔

ایک پابندی یہ لگائی کہ خفیہ تعلق نہیں ہو گا۔

ولا متخذٰت اخدان (سورۃ النساء:4، آیت:25)

(اور نہ خفیہ طور پر ناجائز آشنائیاں پیدا کریں۔)

ولا متخذی اخدان (سورۃ المائدۃ:5، آیت:5)

(اور نہ خفیہ آشنائی پیدا کرنا۔)

نہ گرل فرینڈ (Girl Friend) نہ بوائے فرینڈ (Boy Friend) جو ہو گا کھلا (Open) اور عام ہو گا۔ اور ان کی مالی ذمہ داریاں قبول کر کے ہو گا۔ نکاح کے لیے قرآن پاک نے چند شرطیں لگا دیں۔ ایک شرط یہ کہ ان کی مالی ذمہ داریاں نفقہ کی (مہر کی نہیں) زندگی بھر کی مالی ذمہ داری قبول کرتے ہو تو اجازت ہے۔ خفیہ نہیں اعلانیہ "**محصنین غیر مسٰفحین ولا متخذی اخدان**" (سورۃ المائدۃ:5، آیت:5)

قرآن نے چار باتیں کہی ہیں: ایک یہ کہ مالی ذمہ داری قبول کرو۔ دوسری بات ہے کہ گھر بسانا مقصد ہو، محض خواہش پوری کرنا نہیں، "محصنین "یعنی گھر بساؤ گے، "غیر مسافحین "یعنی محض خواہش پوری نہیں کرو گے۔ تیسرے خفیہ تعلق نہ ہو، اعلانیہ ہو، اس لیے کم از کم دو گواہوں کی شرط رکھی ہے، فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اس سے کم میں نکاح کی اجازت نہیں ہے، خاتون سے خفیہ تعلق نہیں ہو گا اعلانیہ ہو گا۔ چوتھی مالی ذمے داریوں کے ساتھ ہو گا، گھر بسانا ہو گا۔

اس معاملے میں قرآن پاک نے اور جناب خاتم النبیین ﷺ نے چند بنیادی تبدیلیاں کی تھیں جن میں سے میں نے تین چار کا ذکر کیا ہے کہ جاہلیت کے نظام میں یہ تھا اور اسلام نے آکر یہ یہ تبدیلیاں کی ہیں۔ یوں چند تبدیلیاں میں نے ذکر کی ہیں۔ اور نکاح میں جاہلیت کے زمانے میں کی جانے والی اصلاحات کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ آج کا عالمی نظام ہم سے جن تبدیلیوں کا تقاضا کر رہا ہے وہ اسلام کے نظام سے خاصی مختلف ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تمہید

تصوف کے متعلق یہ بحث اب فضول ہو چکی ہے کہ کون سا تصوف اسلامی ہے؟ اور کون سا غیر اسلامی؟ اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا اور اس مسئلے کی وضاحت اس کثرت کے ساتھ کی جا چکی کہ اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تصوف کے نام پر جو خرافات، غیر اسلامی اعمال اور لغو چیزیں مفاد پرست اور مادہ پرست لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں، انھیں تصوف کہنا ہی غلط ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں پھیلی بدکاریوں کی بنا پر اسلام کو بدنام نہیں کیا جا سکتا، اُسی طرح جاہل اور مادہ پرست ٹولے کی حرکتوں کی وجہ سے تصوف کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ ابوالمجاہد زاہد نے بہت خوب کہا ہے:

تصوف اُس جگہ سے غیر اسلامی تصوف ہے
جہاں سے ساتھ چھوڑا ہے تصوف نے شریعت کا

قرونِ اولیٰ سے لے کر عہدِ جدید تک کے تمام علما و صالحین اس بات کی وضاحت کرتے آئے ہیں کہ تصوف کا مقصد رضائے الٰہی اور اس کے حصول کا راستہ اتباعِ سنت ہے۔ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی راہ سے ہٹ کر جو راہ بھی اختیار کی جائے گی، وہ ناقابلِ قبول بھی ہو گی اور باعثِ عذاب بھی۔ اس سلسلے میں حضرت ذوالنون مصریؒ کا یہ قول ہماری رہنمائی کرتا ہے:

من علامات المحب لللہ عزوجل متابعة حبيب الله ﷺ فی أخلاقه و أفعاله وأوامره وسننه۔[1]

”اللہ سے محبت کرنے والے کی پہچان یہ ہے کہ وہ اخلاق، اعمال، احکام اور ہر چیز میں اللہ کے محبوب کی پیروی کرتا ہو۔“

اسی طرح حضرت جنید بغدادی کا یہ ارشاد بھی بہت فیصلہ کن ہے:

مذهبنا هذا مقيد بأصول الكتاب والسنة، و علمنا هذا مشيد بحديث رسول الله ﷺ۔[2]

"ہمارا یہ راستہ کتاب و سنت کے اصول سے بندھا ہوا ہے اور یہ علم احادیثِ رسول سے وابستہ ہے۔"

تصوف کی ضرورت

کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی روح پاک ہو چکی، اس کا دل صاف شفاف ہو چکا، اُسے رضائے الٰہی کی نعمت مل چکی اور اب کبھی یہ چیزیں اُس سے دور نہیں ہو سکتیں۔ جب یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو اِن چیزوں کے حصول کے لیے کی جانے والی کوشش کی اہمیت کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ روح کی پاکیزگی، قلب کی صفائی اور رضائے الٰہی کی کوشش ایسے اعمال ہیں، جو انسان کی موت تک جاری رہنے چاہییں۔ اُس وقت تک، جب تک کہ انسان کے لیے اعمالِ خیر کا دروازہ بند نہ ہو جائے۔ کیوں کہ:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بہت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ تصوف وہی چیز ہے، جس کو قرآن کریم کی اصطلاح میں تزکیہ اور حدیثِ نبوی کی اصطلاح میں احسان کہا گیا ہے۔ اس لیے کسی کو تصوف کے نام پر کوئی اعتراض ہو تو اِن دونوں ناموں میں سے کوئی ایک یا دونوں اختیار کر لے۔ لیکن اس کی ضرورت یا عدمِ ضرورت پر کوئی بحث نہیں کی جا سکتی۔ تزکیہ و احسان کی ضرورت ہر مسلمان کو ہر دور میں تھی، ہے اور رہے گی۔[3]

مزید لکھتے ہیں: احسان اور فقہ باطن سب علمی و شرعی حقائق اور دین کے مسلّمہ اصول ہیں، جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں۔ اگر اہلِ تصوف اس مقصد کے حصول کے لیے (جس کو ہم تزکیہ و احسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص اور متعیّن راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لیے کہ زمان و مکان اور نسلوں کے مزاج اور ماحول کے ساتھ اصلاح و تربیت کے طریقے اور ان کے نصاب بھی بدلتے رہتے ہیں) اور وسیلے کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلے میں آج سب یک زبان ہوتے اور اختلاف کا سر رشتہ ہی باقی نہ رہتا۔ سب دین کے اس شعبے اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں، صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تامل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی روح، دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ کہ جب تک اس شعبے کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی جائے، اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہو سکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آ سکتا ہے۔[4]

دو بنیادی سوالات

تصوف کی اہمیت اور ضرورت واضح ہونے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ تصوف کی عصری معنویت کیا ہے؟ دوڑ بھاگ سے بھری ہوئی زندگی میں ہم کسی کو تصوف کی اہمیت کیسے سمجھا سکتے ہیں؟ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنی روحانی تربیت کے لیے کچھ وقت نکالو۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ داری کے اس دور میں ہم کسی کو تصوف کے اعمال کی طرف کیسے بلا سکتے ہیں؟ کیا آج کا انسان یہ سمجھنے پر آمادہ ہوگا کہ تصوف اُس کی زندگی کی ایک اہم بلکہ سب سے اہم ضرورت ہے؟ اگر کوئی شخص اس کی تسلیم کرلے تو ہمیں اُس کی روحانی تربیت کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا؟ نہ اب اہلِ حق کی خانقاہیں عام ہیں کہ انسان وہاں جاکر کچھ وقت لگائے اور اپنی روحانی تربیت کا انتظام کرے۔ جو چند خانقاہیں موجود ہیں، وہاں جاکر کچھ وقت لگانا عام انسان کے لیے نہایت مشکل ہے۔ گویا اب ہمارے سامنے دو بنیادی سوالات ہیں:

۱. کیا اکیسویں صدی کے انسان کے لیے تصوف کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟

۲. اکیسویں صدی میں ایک عام انسان کی اصلاحِ باطن کے کیا کیا طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں؟

آئیے! ان دونوں سوالات پر قدرے تفصیل سے گفتگو کریں۔

موجودہ انسانی مسائل اور تصوف

آج کے انسان کے تمام روحانی امراض کی جڑ مادیت پرستی ہے۔ روحانی وجود کی حفاظت کے لیے روحانیت کی تقویت ضروری ہے، لیکن آج کے انسان کو اس کے مواقع بہت کم حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا میں روحانی وجود خال خال نظر آتے ہیں۔ غور کیا جائے تو مادیت پرستی کا یہ مرض تین شکلوں میں ظاہر ہو رہا ہے: (۱) بناوٹی زندگی (۲) داخلی اضطراب (۳) فساد فی الارض۔ یہ تینوں شکلیں اپنا مستقل وجود بھی رکھتی ہیں اور ایک دوسرے سے بندھی ہوئی بھی ہیں۔ انسان سب سے پہلے اپنے ظاہر کو دکھاوے اور بناوٹ کا عادی بناتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی روح مردہ، ضمیر بے دم اور دل بے جان ہوکر رہ جاتا ہے۔ پھر اس روحانی موت کا نتیجہ فساد فی الارض کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی محدود پیمانے پر اور کبھی وسیع ترین پیمانے پر۔

ا۔ بناوٹی زندگی

بناوٹی زندگی بظاہر کوئی بڑی مصیبت نہیں لگتی، لیکن معمولی غور وفکر کے بعد اس نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے کہ یہ موجودہ دنیا کے اکثر امراض کی جڑ ہے۔ امریکا سے نکلنے والے مشہور جریدے Psychology Today نے ۲ جولائی ۲۰۱۸ کو اپنی ویب سائٹ پر پروفیسر کلیر براؤن (Prof. Clair Brown) کا ایک تحقیقی مضمون شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں کئی اہم اشارات کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار امریکا میں بیٹھ کر اس نتیجے تک پہنچی ہیں کہ دکھاوے کی زندگی سے انسان کو بہت نقصانات ہو رہے ہیں اور یہ زندگی انسانیت کو مختلف ذہنی، جسمانی اور سماجی مصیبتوں سے دوچار کررہی ہے۔ اس مضمون

کی کچھ سطریں ملاحظہ کیجیے:

Not much from a happiness or social welfare viewpoint, as Buddhist economics explains. While a person shows off their self-importance, they are still wanting more because another rich person has an even longer yacht or bigger house. The valuation of consumption rests on comparing ourselves to one another. Thorstein Veblen, the 20th Century economist who coined the terms “conspicuous consumption” and “invidious comparisons,” pointed out how individuals use luxury goods to show off their status. Veblen observed that people were living on treadmills of wealth accumulation, competing incessantly with others but rarely increasing their own well-being. This means that when inequality increases, we all feel less well-off even if our income has not gone down. When the rich get even richer and the rest of us don’t get more, our stagnant income and lifestyles seem diminished. Over the past four decades, economic growth has mostly gone to the top 5% of households, and this growth begets more inequality, without increasing social welfare as it exacerbates invidious comparisons.[5]

”صرف خوشی یا سماجی بہبود کے نقطۂ نظر سے نہیں، جیسا کہ بدھ مت کی معاشیات بیان کرتی ہے، بلکہ عام طور پر جب کہ ایک شخص اپنی خود کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے، تو دراصل وہ اس سے بھی زیادہ کا طالب ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے سامنے دوسرا امیر شخص ہوتا ہے، جس کے پاس اس سے بھی لمبی یاٹ یا بڑا گھر ہوتا ہے۔ کھپت کی تشخیص خود کو ایک دوسرے سے موازنہ کرنے پر منحصر ہے۔ Thorstein Veblen بیسویں صدی کے ماہر معاشیات جنھوں نے "spicuous consumption" اور "invidious comparisons" جیسی اصطلاحات وضع کیں، انھوں نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ لوگ اپنی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے کس طرح پر تعیش اشیا کا استعمال کرتے ہیں۔ ویبلن نے بتایا کہ لوگ دولت جمع کرنے کی ٹریڈ مل پر زندگی گزار رہے ہیں، دوسروں کے ساتھ مسلسل مقابلہ کر رہے ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی اپنی فلاح و بہبود میں اضافہ کر پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب عدمِ مساوات بڑھ جاتی ہے، تو ہم سب اپنی کم خوش حالی محسوس کرتے ہیں، چاہے ہماری آمدنی کم نہ ہوئی ہو۔ جب امیر اور بھی امیر ہو جاتے ہیں اور ہم میں سے باقی لوگ زیادہ امیر نہیں ہوتے ہیں تو ہماری رکی ہوئی آمدنی اور طرز زندگی کم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ پچھلی چار دہائیوں کے دوران، اقتصادی ترقی زیادہ تر گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ

5٪ تک پہنچی ہے اور یہ ترقی سماجی بہبود میں اضافہ کیے بغیر، مزید عدمِ مساوات کو جنم دے رہی ہے کیوں کہ یہ ناگوار مقابلے کو بڑھاتی ہے۔"

اس اقتباس کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ آج کے انسان نے اپنے اوپر بناوٹ کا ایک خول چڑھالیا ہے۔ اس کی ساری تگ و دو اس خول کی سجاوٹ اور بناؤ سنگار میں صرف ہو رہی ہے۔ اس کا اوڑھنا پہننا، کھانا پینا، بولنا چالنا، تجارت یا ملازمت کرنا، اولاد کی تربیت کرنا، ملنا جلنا، حتیٰ کہ سوچنا سمجھنا بھی دوسروں کو پیش نظر رکھ کر ہوتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ کیا سوچیں گے؟ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ ان سوالات کے ارد گرد اس کی پوری زندگی گھوم رہی ہے۔ وہ اس بناوٹ کے لیے اپنا مال دولت زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس کے لیے دن رات ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ گھر والوں کے ساتھ وقت گزار کر ملنے والی خوشی اور دوستوں یاروں کے ساتھ کی جانے والی موج مستی سے وہ محروم رہتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ متعدّد ذہنی، فکری اور جسمانی امراض کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والی بے شمار تحقیقات کے مطابق اس طرح کی غیر فطری زندگی گزارنے کی وجہ سے دورانِ خون کا بڑھنا (High Blood pressure)، شکر (Sugar)، امراض قلب (Heart diseases)، پیٹ کی متعدّد بیماریاں، مختلف طرح کے سر درد، جنسی مسائل، بے خوابی، گردن اور ٹانگوں کے امراض اور اس طرح کے دسیوں امراض پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ امراض سننے میں تو بہت عام معلوم ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ ان امراض کے مستقل شکار رہتے ہیں، وہ کس صورت حال سے دوچار رہتے ہیں، وہی جانتے ہیں۔ ان امراض سے انسان جن مسائل کا شکار ہے، وہ تو اپنی جگہ ہیں، ان کے نتیجے میں خرچ ہونے والے سیکڑوں کروڑ کے مالی وسائل بھی انسانیت کے لیے سوہانِ روح سے کم نہیں ہیں۔

اس بڑے انسانی مسئلے کو سامنے رکھ کر جب ہم صوفیائے کرام کی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اُن کے ہاں مختلف ناحیوں سے اس بنیادی مسئلے کا حل موجود ہے۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات پر مشتمل کتابیں توکل علی اللہ، زہد فی الدنیا، استغنا، دنیا اور اہل دنیا سے بے زاری، حب فی الآخرۃ، مادے کی بے حیثیتی اور اس طرح کی دوسری تعلیمات سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ساری چیزیں وہ ہیں، جو انسان کو ظاہر سے باطن کی طرف، تکلف سے بے تکلفی کی طرف، بناوٹ سے حقیقت کی طرف، حرص و ہوس سے قناعت و توکل کی طرف لے جاتی ہیں۔ جو انسان ان اعلیٰ تعلیمات کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ بناوٹی زندگی اور اس کی لعنتوں سے دور ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے دل و دماغ میں ایسا سکون و اطمینان رچ بس جاتا ہے کہ اسے دنیا کی رنگا رنگی اور بناؤ سنگار سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ اس سلسلے میں امام احمد ابن حنبل کا یہ قول ہمیں روشنی دکھاتا ہے:

الزهد على ثلاثة أوجه، ترك الحرام وهو زهد العوام، والثاني ترك الفضول من الحلال وهو زهد الخواص، والثالث ترك ما يشتغل العبد عن الله تعالىٰ

وھو زھد العارفین۔[6]

"زہد تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک حرام کاموں کو چھوڑنا، یہ عوام کا زہد ہے۔ دوسرے حلال چیزوں میں سے بھی ضرورت سے زائد چیزوں کو چھوڑنا، یہ خواص کا زہد ہے۔ تیسرے ہر اس چیز کو چھوڑنا جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے، یہ عارفین کا زہد ہوتا ہے۔"

اگر آج کا انسان زہد کے ان تین مراحل میں سے صرف پہلے مرحلے کا اہتمام کر لے تو بھی اس کے مسائل بآسانی حل ہو سکتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے مرحلے کے زہد کا تو پوچھنا ہی کیا۔

۲۔ داخلی اضطراب

انیسویں صدی میں دنیا نے ایک طرف صنعت و ایجادات کے حوالے سے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کرنی شروع کی، تو دوسری طرف انسان کو ایک نئے مرض سے سامنا کرنا پڑا۔ تنہائی اور اکیلا پن (Loneliness)۔ یہ مرض اس سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، لیکن صرف انفرادی طور پر یا بہت محدود پیمانے پر۔ انیسویں صدی میں اس مرض نے شدید وسعت اختیار کر لی۔ اب دنیا کا بڑا حصہ اس سے متاثر ہو گیا۔ اس کے اثرات نے بھی خطرناک رخ اختیار کر لیا۔7

دراصل صنعتی انقلاب کے بعد انسان کی پوری زندگی نے مشینی رخ اختیار کر لیا۔ آہستہ آہستہ اس کی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا کام مشینوں پر منحصر ہو گیا۔ ساتھ ہی دولت کی ریل پیل نے ہر انسان کے سر پر مادیت کا نشہ سوار کر دیا۔ انسان کا مقصد کمانا کھانا اور مادیت کی راہ میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی دوڑ لگانا بن گیا۔ مادی لحاظ سے بڑے لوگوں کو خدا بنا دیا گیا اور ان کی خوش نودی کے لیے سب کچھ ہنسی خوشی کرنا عقل مندی تصور کیا جانے لگا۔ خودداری، انسانی ہمدردی، غریبوں کی دل داری اور اعزہ و اقارب کی خبر گیری کو غیر ضروری اور نادانی کے کام سمجھا جانے لگا۔

گویا انسان خود بھی چلتی پھرتی مشین بن گیا۔ ایسی مشین جس میں نہ دل ہوتا ہے اور نہ احساس۔ وہ تو دن رات اپنے مالک کے اشارے کے مطابق کام میں لگی رہتی ہے۔ مالک اسے کچھ آرام دے دے یا اس میں تیل وغیرہ ڈال دے تو اس کا احسان ہے۔ اس میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ مالک کی مرضی کے خلاف زبان ہلا سکے۔ اسی طرح چلتے چلتے وہ مشین ایک دن بند ہو جاتی ہے۔ پھر کبھی نہیں چل پاتی۔ اگلے ہی دن مالک اس کو کوڑے کے بھاؤ بیچ کر دوسری مشین لے آتا ہے۔ اس پورے نظام میں پسنے والا انسان شدید اکیلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ روحانی بے چینی، اندرونی اضطراب، بہت کچھ ہونے کے باوجود شدید خالی پن کے احساس اور یاس و قنوط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

پھر یہ چیزیں جسمانی امراض کی شکل اختیار کرتی ہیں تو سخت ذہنی دباؤ، قلبی امراض اور متعدّد نفسیاتی امراض اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ جو لوگ ان امراض کے لیے کسی ڈاکٹر کا رخ نہیں کرتے یا اپنے احساسات کو زیادہ عرصے تک دبائے رہتے ہیں وہ نشے کی دنیا میں اپنی پناہ ڈھونڈتے ہیں یا اپنی زندگی کے خاتمے کو ہی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ہر

سال ہونے والے خودکشی کے واقعات اور نشے کی بڑھتی ہوئی رفتار کے پیچھے یہی داخلی اضطراب کار فرما ہے۔8

ان مسائل سے جوجھتا ہوا انسان جب تصوف کی طرف آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا سابقہ ایک رہنما سے پڑتا ہے۔ جسے تصوف کی اصطلاح میں مرشد یا پیر کہا جاتا ہے۔ ایک ایسا انسان جو حتی الامکان اپنے اندرون کو صاف کر چکنے کے باوجود خود کو ناقص سمجھتا ہے اور دوسروں کو پیار محبت سے صحیح راہ دکھاتا رہتا ہے۔ اس کا دروازہ خلق خدا کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ وہ ہر طالب کی باتیں سکون سے سنتا ہے اور پھر اس کی کچھ رہنمائی کرتا ہے۔ اکیلے پن اور خالی پن کے شکار انسان کو اور کیا چاہیے؟ یہ تو اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یعنی اسے راہِ سلوک پر گامزن ہونے سے پہلے ہی مسائل کا حل اور غموں کا مداوا مل جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ مرشد کامل سے حسب توفیق استفادہ کر کے سکون و اطمینان کی فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔ مرشد کے پاس اسے ذکر و اذکار کے ذریعے اللہ کے قادر مطلق ہونے اور باقی سب کے عاجز ہونے کا سبق ملتا ہے۔ مراقبے اور مجاہدے کے ذریعے اسے اللہ کے باقی ہونے اور باقی سب کے فانی ہونے کا علم ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ محبت و موانست، خلق خدا کی خدمت اور ان کے ساتھ ہم دردی کو سب سے عظیم عبادت جاننے کا درس ملتا ہے۔ اپنے رشتے داروں، پڑوسیوں اور دوستوں یاروں کی خبرگیری، عیادت، تہنیت، تعزیت اور ان کے ساتھ ہنستے بولتے کچھ وقت گزارنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تمام تعلیمات اس کی زندگی کی کایا پلٹ دیتی ہیں۔ اس طرح وہ مایوس انسان اپنی روح کو پر سکون اور جسم کو صحت مند کر کے خالق کائنات کے نظام فطرت کا حصہ بن جاتا ہے۔

۳۔ فساد فی الارض

موجودہ دنیا کا تیسرا سب سے بڑا مسئلہ فساد فی الارض ہے۔ یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پھیلائے جانے والے مختلف بگاڑوں کو فساد سے تعبیر کیا ہے۔9 اس زمین پر برپا ہونے والا پہلا فساد وہ تھا، جو حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کا خون بہا کر پیدا کیا تھا۔10 آخری فساد قیامت کے بالکل قریب مسیحِ دجال کے ذریعے برپا کیا جائے گا۔11 اس پہلے اور آخری فساد کے درمیان واقع ہونے والا ہر وہ واقعہ جس سے انسانیت مصیبت میں گرفتار ہو، اسے فساد فی الارض کہا جاتا ہے۔ کفر و شرک، لوٹ مار، کالابازاری، دھوکہ دہی، چوری ڈکیتی، زنا کاری، قتل و غارت گری، دنیوی فائدے کے لیے ہونے والی جنگیں، دولت کے نشے میں انسانیت کو نشے اور جنسیات کا عادی بنانا، اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے نئے نئے موذی امراض پھیلانا یا بڑے بڑے گھوٹالے کرنا، میڈیا کے ذریعے جھوٹ پھیلانا، رشوت خوری، سودی کاروبار، جوا یا سٹے بازی، ظالمانہ ٹیکس اور اس طرح کی بے شمار چیزیں زمین میں فساد برپا کرنے میں شامل ہیں۔ ماضی قریب میں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والا پر اسرار مرض Covid-19 بھی فساد فی الارض کی ایک شکل تھی۔ دنیا کے مٹھی بھر انسانوں پر فساد فی الارض کا دورہ پڑتا ہے اور وہ پوری انسانیت کو انتہائی نازک حالات سے دوچار

کردیتے ہیں۔ ماضی میں بھی یہی ہوا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس میں عام انسانوں کا جرم یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی فسادی طاقتوں کے ہاتھوں کٹ پتلی بن جاتے ہیں۔ ان کے سجھائے ہوئے خطرناک راستے پر چلنے لگتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک انسان ہیں۔

تصوف کے اندر اس بات کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ انسان کو انسان بنائے۔ آدمیت کا سبق یاد دلائے۔ نفس پرستی کے راستے سے ہٹا کر خدا پرستی کی راہ پر لگائے۔ اللہ کی بنائی ہوئی اس حسین دنیا کو جہنم کے بجائے جنت بنائے۔ تصوف میں خلق سے محبت، مخلوق کی خدمت اور ہر انسان کو اپنا بنانے کا جو درس بنیادی حیثیت رکھتا ہے، وہی درس فساد سے بھری اس دنیا کو جنت نما بنا سکتا ہے۔ یہ طاقت امن کے علم بردار کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔ کیوں کہ دوسرے مذاہب امن کی دعوت تو دے سکتے ہیں، لیکن نہ تو پوری انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کر سکتے ہیں اور نہ انسانوں کو عالمی بھائی چارے کا درس دے سکتے ہیں۔ یہ کام صرف اسلام کر سکتا ہے کہ سارے انسانوں کو وحدانیت کے محور کے گرد جمع کرے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کا تصور دے کر رنگ، نسل، ذات اور علاقائیت کے ہر بت کو پاش پاش کر دے۔ شاید ہم برصغیر والے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، کیوں کہ ہمارے پاس حضرت سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز اور ان جیسے بے شمار اولیا و اصفیا ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص نے ہزارہا ہزار بندگان خدا کو ان کے رب سے جوڑنے اور فساد فی الارض کو ختم کرنے کا کام نہایت وسیع پیمانے پر انجام دیا ہے۔

امکانات

عہد حاضر میں تصوف کی معنویت اور اہمیت و افادیت سمجھنے کے بعد اب یہاں دوسرا سوال سامنے آتا ہے۔ آج کے دور میں تصوف کے لیے کیا امکانات موجود ہیں؟ کیا آج کے انسان کے لیے تصوف کو قابل عمل بنایا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے مسائل حل کر سکے؟ کیا تصوف کا سیکڑوں سالہ قدیم نظام اپنے اندر ایسی لچک رکھتا ہے، جس کے ذریعے وہ اکیسویں صدی کے بدحال انسان کے لیے لائقِ عمل بن سکے؟ اس کا بہت آسان جواب یہ ہے کہ تصوف اسلام کا ایک انتہائی اہم شعبہ ہے۔ لہٰذا جس طرح اسلام کے اندر ہر دور اور زمانے کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے، اُسی طرح تصوف کے اندر بھی یہ صلاحیت بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ لیکن تصوف کو آج کے انسانی مسائل کے لیے بہترین عملی حل کے طور پیش کرنا، اُس وقت تک کوئی حیثیت نہیں رکھتا، جب تک کہ اسے عملی نہ بنا دیا جائے۔ اس بڑے مرحلے کو طے کرنے کے لیے یہ عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ معاشرے میں تصوف کی پوزیشن واضح کی جائے۔ تصوف کے نام پر بددینی اور اسلام مخالف چیزوں کو فروغ دینے والوں کی سخت مذمت کی جائے۔ دنیا کو بتایا جائے کہ تصوف اِس گورکھ دھندے کا نام نہیں، بلکہ ایک پاکیزہ اسلامی تربیتی نظام کا نام ہے۔

۲۔ اپنے اندر وہ کشادہ دلی، مال و جاہ سے بے زاری، سخاوت، تواضع، نرمی اور جھکاؤ، اعتدال و میانہ روی اور خوش خلقی پیدا کی جائے، جو ہر دور میں صوفیائے کرام کی شناخت رہی ہے۔

۳۔ خانقاہوں کے دروازے نئی نسل کے لیے کھول دیے جائیں۔ اس طور پر کہ انھیں خانقاہوں میں وحشت اور اجنبی پن محسوس نہ ہو۔ اس کے لیے خانقاہوں کے ظاہری ماحول کو بھی مناسب بنانا ہوگا اور اہلِ خانقاہ کی وضع قطع اور اخلاق میں بھی بڑی تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔

۵۔ خانقاہوں میں اس طرح کے پروگرام منعقد کیے جائیں، جن میں آج کا انسان دلچسپی محسوس کرے۔ مثلاً: آپ کے مسائل اور اُن کا حل، نوجوانوں کے مسائل: اسباب و علاج، تعلیم: کیوں اور کیسے؟، معاشی تنگی: اسباب اور حل، ذہنی الجھنوں کے اسباب اور علاج، روحانی بے چینی کے اسباب و علاج، گھریلو جھگڑے اور ان کا حل۔

۶۔ مذکورِ بالا موضوعات پر چھوٹے چھوٹے پمفلٹ، عالمی و علاقائی زبانوں میں دل کش گٹ اَپ کے ساتھ شائع کرنا۔ ساتھ ہی ان موضوعات پر آڈیو، ویڈیو مواد فراہم کرنا۔

۷۔ معروف و غیر معروف بزرگانِ دین کے احوال کو ہر ممکنہ وسیلے کے ذریعے گھر گھر پہنچانا۔

۸۔ ایسے آن لائن یا آف لائن پروگرام منعقد کیے جائیں، جن میں عوام کو اپنے احساسات پیش کرنے کا موقع بھی مل سکے۔ جیسے: روحانی، ذہنی اور فکری الجھنوں پر سوال جواب کا پروگرام۔

۹۔ اس طرح کے پروگرام خانقاہوں سے نکل کر تعلیمی اداروں اور دوسرے اہم مقامات پر منعقد کرنے کی بھی کوشش کی جائے۔

۱۰۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اہلِ تصوف، بالخصوص مشائخ و مرشدین اپنے اور عوام کے درمیان حائل اونچی دیواروں کو ڈھادیں، تاکہ دوریاں ختم ہوں، شکوک و شبہات کے جالے جھڑ جائیں اور عوام کو بلاواسطہ مشائخ و مرشدین کی زندگیوں میں تصوف کا عملی نمونہ دیکھنے کو ملے۔

یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ ان میں سے بہت سے اہم اقدامات مختلف معتبر خانقاہوں اور مستند مشائخ کی جانب سے کیے جا رہے ہیں۔ الحمد للہ اس کے مثبت نتائج بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن ان اقدامات کی رفتار بہت سست اور مقدار بہت کم ہے۔ اہلِ تصوف کو مذکور بالا تمام کام پوری قوت کے ساتھ کرنے ہوں گے۔ ان شاء اللہ پھر عہدِ حاضر میں تصوف کی معنویت بھی واضح ہوگی اور بے چین انسان کو چین سکون بھی میسر آئے گا۔

خاتمہ

اکیسویں صدی میں تصوف کی معنویت اور امکانات کے متعلق اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اکیسویں صدی میں اسلام کے نظامِ تزکیہ واحسان اور نظامِ تصوف و سلوک کے لیے کام کرنے کا وسیع میدان کھلا ہوا ہے۔ آج کے انسان کو پہلے سے کہیں زیادہ تصوف کی ضرورت ہے۔ اگلے زمانوں کا انسان صرف روحانی امراض کے علاج کے لیے تصوف سے وابستہ ہوتا تھا، آج کا انسان روحانی امراض کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی بیمار ہو چکا ہے۔ بیماریاں بھی معمولی نہیں، مہلک اور تباہ کن۔ آج کے انسان کے بے شمار مسائل حل ہو جائیں، اگر وہ خلوص دل کے ساتھ اس نظام کا تجربہ کر دیکھے۔ اس کی زندگی سکون و اطمینان سے بھر جائے۔ بے چینی اور اضطراب ختم ہو جائے۔ کیوں کہ دنیا کی بے حیثیتی، اخروی زندگی کی ہمیشگی کا یقین، مادے (Material) کے بے اصل ہونے، بہ ظاہر معمولی نظر آنے والے اخلاقی امراض کے انتہائی خطرناک ہونے کا یقین، ایک ذات کے مالک و حاکم ہونے اور باقی سب کے غلام و حقیر ہونے کا احساس، دنیا کی سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی کو سمجھنا اور اس کے حصول کو اپنی زندگی کا مدار اور محور بنانا، ایک خاص ترتیب کے ساتھ رشتے داروں، عزیزوں، پڑوسیوں، دوستوں، غریبوں، ناداروں، حتیٰ کہ جانوروں، پرندوں اور نباتات تک کے حقوق کی اہمیت، انسان کو ایک فطری زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہے۔ شریعت کی روشنی میں ان تمام عقائد و اخلاق کی تربیت کا نام ہی تصوف ہے۔ عقائد کی پختگی اور اخلاق کی برتری ہی تصوف کا موضوع ہے۔ اگر انسانیت اس عظیم نظام سے وابستگی اختیار کر کے اپنا سفر آگے بڑھائے گی تو مادی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی بھی اس کا مقدر بن جائے گی۔ وہ روحانی ترقی، جس کے بغیر مادی ترقیات انسان کے لیے آفت اور مصیبت بن چکی ہیں۔ بالکل اسی طرح، جس طرح روح کے بغیر جسم بے کار ہوتا ہے، اُسی طرح دنیا کی روحانی ترقی کے بغیر مادی ترقی کا کوئی مطلب نہیں۔

حوالہ جات/حواشی

1. قشیری، ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن، الرسالۃ القشیریۃ فی علم التصوف، المکتبۃ التوفیقیۃ، قاہرہ، 2015، ص 40
2. الرسالۃ القشیریۃ، حوالۂ سابق، ص 82
3. ندوی، سید ابوالحسن علی، تزکیہ واحسان یا تصوف و سلوک، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، 1979، ص 13-16
4. تزکیہ واحسان یا تصوف و سلوک، حوالۂ سابق، ص 16,17
5. https://www.psychologytoday.com

6. الرسالۃ القشیریۃ، حوالہ سابق، ص 232

7. وکی پیڈیا کا مقالہ، بعنوان Loneliness

8. اس موضوع پر بڑا لٹریچر وجود میں آچکا ہے۔ بیسیوں تحقیقاتی رپورٹیں انٹرنیٹ پر دست یاب ہیں۔ مثلاً Loneliness: Causes and Health Consequences کے موضوع پر Kendra Cherry کا مختصر مضمون https://www.verywellmind.com پر دیکھا جاسکتا ہے۔

9. نمونے کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں: البقرہ 30,60,204-206، المائدہ 33,64، ہود 85، الرعد 25

10. المائدہ، آیت 31

11. دجال کے سلسلے میں رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بہت تفصیل کے ساتھ انسانیت کو خبردار فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں احادیث کی کتابوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر صحیحین میں کتاب الفتن سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں سب سے بڑی جنگ "انسانی حقوق" اور اس سے وابستہ ان تمام مسائل کی ہے جن کی تار کہیں نہ کہیں سے انسانی حقوق سے جڑی ہوئی ہے۔ انسانی حقوق کے ذیلی شعبہ جات پر اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو سوسائٹی خود مختاری، آزادی اظہار رائے، حقوق نسواں، جان و مال کا تحفظ، تہذیب و تمدن کی بقاء، حق ملکیت، عدل و انصاف، معیشت و تجارت، سیاست و حکومت، مذہبی آزادی، خاندانی نظام، اقلیتوں کا لحاظ، باہمی قرابت و دوستانہ تعلقات وغیرہ اس موضوع کے جزو لاینفک ہیں۔ اسلام نے انسانی حقوق کا جس قدر لحاظ رکھا اور "حق دو" کا درس دیا اس جیسی مثال تاریخ عالم کے کسی بھی مذہب یا شریعت میں نہیں ملتی۔ اس کا عملی و آفاقی نمونہ خطبہ حجۃ الوداع ہے جو ۹ ذوالحجہ ۱۰ھ بمطابق 6 مارچ 632ء بروز جمعہ کو محسن انسانیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے مقام پر ایک عالم گیر خطبہ کی شکل میں ارشاد فرمایا تھا جسے قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے حقیقت پسندانہ فکر رکھنے والے مفکرین انسانی حقوق کا بنیادی اور پہلا عالمی منشور مانتے رہیں گے۔

مغرب میں انسانی حقوق کا تصور ارتقاء و تنزل کے کئی منازل طے کر چکا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر اس تصور کی بنیادوں کے حوالے سے بات کی جائے تو مغربی دنیا انسانی حقوق کے حوالے سے تین ادوار کو بطور اتھارٹی و سند کے تسلیم کرتے ہیں۔

ا. پہلا دور تیرہویں صدی عیسوی کا ہے جب 1215ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم کنگ جان کے روبرو میگنا کارٹا کے نام سے انسانی حقوق کے متعلق دستاویز پیش کی گئی اور اسے 82 سال بعد تقریباً 1297ء میں کنگ ایڈورڈ اول کے دور میں نفاذی حیثیت ملی۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ کئی اور اس قسم کے چارٹرز تاریخ کا حصہ بنے لیکن اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اسی میں کئی ترامیم ہوئیں اور دوسرے کئی مغربی ممالک نے مختلف ترامیم کے ساتھ اسے اپنے ملک میں دستوری و قانونی حیثیت دی۔ مثلاً 1628ء petition of rights (حقوق کی عرضداشت) 1689ء میں بل آف رائٹس کے نام سے انسانی حقوق کے حوالے سے قانون سازی ہوئی۔

۲. دوسرا دور اٹھارہویں صدی کے اواخر کا ہے جب فرانس سے جمہوری انقلاب اٹھا جو عوام کی جانب سے مذہبی شخصیات، بادشاہ اور جاگیرداروں کے خلاف اپنے حقوق طلبی کے لیے نمودار ہوا تھا۔

۳. جبکہ تیسرا دور 1945ء سے 1948ء تک کا ہے جس میں اقوام متحدہ کی طرف سے "انٹرنیشنل ہیومن رائیٹس چارٹر" متعارف کرایا گیا اور اس پر دنیا کے تقریباً سبھی ممالک نے دستخط کیے۔ جبکہ اسلام میں انسانی حقوق کو "حقوق العباد" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد وحی ہے، حوالہ کے طور پر قرآن کریم کی سورۃ النساء کی آیت نمبر 36 اور احادیث نبویہ کے ذخیرہ میں سے خطبہ حجۃ الوداع اور حضرت سلمان فارسی اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کی مواخات کے موقع پر پیش آنے والی صورتحال جسے بخاری شریف، کتاب الصیام حدیث نمبر 1968 کے طور پر امام بخاری نے درج کیا ہے جبکہ ترمذی وغیرہ میں بھی الگ سند کے ساتھ موجود ہے، کو پیش کیا جاتا ہے۔

اگر حقیقت پسندانہ نگاہوں سے غور کیا جائے تو مغربی فکر و معاشرہ انسانی حقوق کے حوالے سے جن تین ادوار کو بطور سند کے پیش کرتا ہے ان کی بنیاد بھی یہی مذکورہ آیت و احادیث بالخصوص خطبہ حجۃ الوداع ہے۔ مغرب نے خطبہ حجۃ الوداع کی شقوں میں کئی تبدیلیاں کرنے کے بعد "انسانی حقوق کا منشور" کے نام سے مختلف ادوار میں نئی دستاویزات تیار کر کے دنیا کے سامنے پیش کیں۔ یہاں اس بات سے قطع نظر کہ انسانی حقوق کے درج بالا تمام ذیلی شعبہ جات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کن اہمیتوں کے حامل ہیں اور اسلام نے انسانی حقوق کا کتنا پاس رکھا، فقط یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ خود مغربی مفکرین خطبہ حجۃ الوداع کو اپنے عالمی منشور کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ مشہور مغربی مفکر "لارڈ ایکٹن" خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "اگر یہ کہا جائے کہ آسمان نے روز و شب کی ہزاروں کروٹیں بدلیں، لیکن انسانیت اور حقوق انسانی کے لیے اس سے زیادہ پُردرد اور پُرخلوص آواز نہیں سنی تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا"
> (بحوالہ محسن انسانیت اور انسانی حقوق ص 115)

لارڈ ایکٹن کا یہ اعتراف اس بات کا کھلم کھلا ثبوت ہے کہ مغرب میں انسانی حقوق کا تصور اسلام بالخصوص خطبہ حجۃ الوداع سے ہی لیا گیا ہے۔ "رابرٹ بری فالٹ" نے اقوامِ مغرب کی تہذیب و ثقافت کے تاریک دور کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے حقائق کے دریچوں سے مزید پردہ سرکا دیا، رابرٹ بری فالٹ لکھتے ہے کہ

> "پانچویں صدی سے دسویں صدی تک یورپ میں گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے، اور مغربی تہذیب مثل لاش تھی جو متعفن ہو کر گل سڑ چکی تھی، بعد میں مغرب کو نشاۃ ثانیہ کا احیاء مسلمانوں کے اندلس علمی مراکز سے ملا کہ اس سے قبل تو مغرب کے مقتدر ممالک فرانس، اٹلی اور جرمنی میں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور تھا"

رابرٹ کے اس اعتراف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نشاۃ ثانیہ سے قبل مغرب میں مقتدر ممالک کی تہذیب و ثقافت کا

حال بھی ابتر تھا، اور انہوں نے اندلس میں موجود مسلمانوں کے علمی مراکز سے اپنی تہذیب وثقافت کی بہتری کے گر سیکھے اور اندلس کی تہذیبی شناخت یا مراکز کی علمیت کی بنیاد پیغمبر علیہ السلام سے منسوب وحی ہی تھی۔

مزید اس حوالے سے غیر مسلم سیرت نگار جان بیگٹ المعروف "جنرل گلب پاشا" اپنی کتاب "دی لائف اینڈ ٹائم آف محمد" میں لکھتے ہیں کہ

"مؤرخین نے حضور کے اس تاریخی خطبہ کو محفوظ کر لیا ہے، آپ کا یہ آخری حج اپنی نوعیت میں ایک امتیازی شان لیے ہوئے ہے، آپ نے جو کچھ بھی اس تاریخی موقع پر کہا اس کی پیروی ہمیشہ ہوتی رہے گی" (دی لائف اینڈ ٹائم آف محمد، مترجم ص 582)

جان بیگٹ کا یہ اعتراف بھی اس حقیقت پر مہر تصدیق ہے کہ مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا پیش کردہ عالمی منشور خطبہ حجۃ الوداع سے ہی ماخوذ ہے۔

مغرب اگر خطبہ حجۃ الوداع کو بغیر تبدیل کیے "عمرلاء" کی طرح من وعن نافذ کرتا اور دنیا کے سامنے بے شک اپنے تجربات کی روشنی میں پیش کرتا تو بعید نہیں تھا کہ عالم اسلام بھی اس سے مستفید ہوتا اور دنیائے مغرب سے جڑے ممالک بھی بلا اختلاف وتنقید اس سے وابستہ رہتے۔ اور مغربی دنیا کو 1215ء کے بعد دسیوں بار اس میں ترامیم کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔ لیکن مغرب نے خطبہ حجۃ الوداع کو سامنے رکھ کر اس سے نکات ماخوذ کیے اور انہیں اپنی خواہشات کے مطابق نئے سانچے میں ڈھال کر جب دنیا کے سامنے متعارف کروایا تو خود کئی مغربی ممالک ایک مدت کے بعد اس نئے منشور سے متنفر ہو چکے ہیں۔ اور مغربی مفکرین کے اس چارٹر کے حوالے سے تاریخ کا ریکارڈ بننے والے تجزیے اور تبصرے دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ ماہر مغربی قانون دان "ہنز کیلسن" لکھتے ہیں کہ

"خالص قانونی نظر سے دیکھا جائے تو منشور کی دفعات کسی بھی ملک پر انہیں تسلیم کرنے اور منشور کے مسودہ یا اس کے ابتدائیہ میں صراحت کردہ انسانی حقوق اور آزادیوں کو تحفظ دینے کی پابندی عائد نہیں کرتی" (the low of united nations London 1950 P. 29 بحوالہ محسن انسانیت اور انسانی حقوق ص 159)

ڈاکٹر رافیل (Raphael) کا بے لاگ تبصرہ بھی ملاحظہ ہو، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

"یہ نام نہاد معاشی اور سماجی حقوق کوئی بین الاقوامی فرض عائد نہیں کرتے" (political theory and the righs of man P. 96 بحوالہ محسن انسانیت اور انسانی حقوق ص 160)

مغربی دنیا نے خطبہ حجۃ الوداع سے سرقہ تو کیا لیکن اب وہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

ماہ محرم الحرام سے اسلامی سال کا آغاز ہوتا ہے، اس ماہ میں ایک ایسا تاریخی اور انقلابی سانحہ پیش آیا کہ جو ہر سال اہلِ ایمان کو عظیم قربانیوں کا سبق دیتا ہے، کربلا کا درس یہ بھی یاد کراتا ہے کہ اصل زندگی خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینا ہے اور میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور خانوادہ رسول کی قربانی کا یہ ہی پیغام ہے۔ حضرت سیدنا حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنھما کی شہادت تاریخِ انسانی کا ناقابلِ فراموش المیہ ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت باسعادت

آپ کی ولادتِ باسعادت ۵ شعبان المعظم ۴ھ کو مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے گوش مبارک میں اذان دی، منہ میں لعابِ دہن ڈالا اور آپ کے لئے دعا فرمائی۔ پھر ساتویں روز آپ کا نام مبارک حسین رکھا اور عقیقہ کیا۔ نام: حسین، کنیت: ابو عبد اللہ، لقب مبارک: سبطِ رسول اور ریحانِ رسول ہے۔

حضور ﷺ کا حسنین کریمین کے ناموں پر فخر

حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کا نام شبر اور شبیر رکھا اور میں نے اپنے بیٹوں کا نام انہی کی طرز پر حسن اور حسین رکھا۔ (صواعق المحرقہ) اسی لیے حسن وحسین کو شبر اور شبیر کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سریانی زبان میں حسنین کریمین کے ناموں یعنی شبر و شبیر اور عربی زبان میں حسن وحسین دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ (صواعق المحرقہ) ایک حدیث مبارکہ میں ہے: حسن اور حسین جنتی ناموں میں سے دو نام ہیں۔ (صواعق المحرقہ) ابنِ الاعرابی حضرت مفضل سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے یہ نام مخفی رکھے یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے نواسوں کا نام حسن اور حسین رکھا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب

آپ کے فضائل میں بہت حدیثیں ملتی ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت یعلی بن مروہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امام حسینؓ کو اپنے انتہائی قریب فرمایا ہے، گویا کہ حسین سے دوستی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دوستی ہے، حسین سے عداوت رکھنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عداوت و دشمنی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے حسینؓ سے محبت کی اس نے اللہ رب العزت سے محبت کی۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا چھوٹا بچہ کہاں ہے؟ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود مبارک میں بیٹھ گئے اور اپنی انگلیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک میں داخل کر دیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا بوسہ لیا اور فرمایا: اے اللہ! میں اس (حسینؓ) سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما اور اس سے بھی جو اس سے محبت کرے۔ (نور الابصار)

شہیدِ کربلا کے کارنامے

شہیدِ کربلا حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک ابھی ساڑھے سات برس تھی کہ والدہ محترمہ خاتون جنت حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا کا انتقال ہو گیا اور آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے شفیق ترین نانا کے بعد حضرت فاطمہؓ جیسی شفیق ترین ماں کی مامتا اور سایہ سے محروم ہو گئے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے شفیق ترین باپ کی پدرانہ شفقت نے آپ کا غم غلط کر دیا اور آپ کی کامل تربیت فرمائی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ قرآن کریم کے حافظ بن گئے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور قرآن کریم کے معانی پر آپ کی خاصی نگاہ تھی۔ اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ نبوی میں کامل تھے۔ تقویٰ، طہارت اور حق گوئی و بے باکی اور جہاد آپ کا شعار تھا۔

دورِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں آپ نو عمر تھے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ اچھے جوان اور سپاہی تھے۔ چنانچہ فتح طبرستان کے لشکر میں، جو حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں گیا تھا، آپ سرفروشانہ شریک تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کو جب باغیوں نے گھیر لیا تھا تو ان کی حفاظت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو مقرر کیا تھا۔ لیکن باغی کسی دوسری جانب سے مکان میں داخل ہو گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے دروازے پر پہرہ دیتے رہے، باغیوں کے اندر داخل ہونے کا انہیں پتہ نہیں چل سکا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر جب حضرت

علی رضی اللہ عنہ وہاں آئے تو انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس بات پر ڈانٹا۔ مگر باغی ایسے راستے سے اندر داخل ہوئے تھے جس کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو علم نہیں تھا۔

دورِ حیدری میں آپ برابر اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دست و بازو رہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں آپ آگے آگے تھے، لیکن جب چھ ماہ بعد وہ حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہوگئے تو حضرت حسینؓ نے بھی اپنے بڑے بھائی کے احترام میں ان کا ساتھ دیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب تمام مسلمانوں کے وظیفے مقرر کیے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وظیفہ پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ وظیفہ آپ کو برابر ملتا رہا۔ یہ وظیفہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں دس لاکھ درہم تک بڑھا دیا، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو برابر ملتا رہا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے تو اس طرح مسلمان ایک بار پھر متحد ہوگئے۔ اور وہ تلوار جو اعلائے کلمۃ الحق کے لیے وقف تھی؛ اور بدقسمتی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے اس کا رخ خود مسلمانوں کی طرف ہوگیا تھا اور پورے دور حیدری میں مسلمان اپنا ہی خون بہانے میں مصروف رہے تھے؛ وہ تلوار پھر جہاد، اعلائے کلمۃ الحق اور اتحادِ ملت کیلئے وقف ہوگئی۔ یہ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مسلمانوں کے اس باہمی اتفاق و اتحاد کے بعد اسلام کی اشاعت جو مسلمانوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے موقوف ہوگئی تھی، ایک بار پھر شروع ہوگئی اور مسلمان یکسو ہو کر اشاعتِ اسلام اور جہاد کے مشن پر گامزن ہوگئے۔

سانحہ کرب وبلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے علم و فضیلت، تقویٰ و طہارت کے باوجود سیاست میں حصہ لیا، بلکہ میدانِ کربلا میں اپنی جان دے کر اسے صحیح رخ پر لانے کی کوشش فرمائی۔ اس طرح آپ نے دین کے صحیح تصور کو قائم اور باقی رکھنے، زندہ اور تازہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ آپ کا عظیم کارنامہ ہے۔ آپ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ سیاسی پہلو میں شورائیت اور انتخابات کے بجائے جو نامزدگی اور ولی عہدی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اس کے خلاف آواز اٹھا کر اور تحریک چلا کر، بلکہ اپنی اور اپنے خاندان کی قربانی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ دین کے کسی پہلو میں بھی بدعت سر اٹھائے تو اسے کسی حال میں برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ ایک کارنامہ آپ کا یہ ہے کہ اگرچہ رخصت کی راہ کھلی ہوئی تھی، مگر آپ نے عزیمت کی راہ اختیار کر کے رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کیلئے سنگِ میل قائم کیا کہ اسلامی خلافت باقی رکھنے کیلئے اور اسے ملوکیت کی راہ پر جانے سے روکنے کیلئے عزیمت کی راہ اپنانا چاہیے اور اپنا خون دے کر اسے صحیح صورت پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مسندِ خلافت اور بیعت

رجب ۶۰ ہجری میں حضرت امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا یزید مسندِ خلافت پر براجمان ہوا تو فسق و فجور، ظلم و جبر، ناانصافی و عہد شکنی کے دور کا آغاز ہو گیا۔ نیز یزید نے خود اور اپنے کارندوں کے ذریعے عالمِ اسلام سے بزورِ جبر اپنے حق میں بیعت لینا شروع کر دی۔ اس وقت مدینہ منورہ میں یزید کا چچازاد بھائی ولید بن عقبہ گورنر تھا۔ یزید نے اسے ایک مختصر سا حکم نامہ ارسال کیا جس میں تحریر تھا کہ حسین ابن علی، عبد اللہ ابنِ عمر اور عبد اللہ ابنِ زبیر کو بیعت اور اطاعت پر مجبور کیا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کے ساتھ پوری سختی کی جائے، یہاں تک کہ تینوں بیعت کر لیں۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو آپ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ ادھر اہلِ کوفہ تواتر کے ساتھ خطوط اور وفود کے ذریعے یہ اصرار کرتے رہے کہ آپ کوفہ آجائیں تاکہ اہلِ کوفہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر سکیں۔

حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت

کوفے والوں کے بے انتہا اصرار اور لاتعداد خطوط کے جواب میں آپ نے پہلے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تاکہ وہاں کے حالات کا صحیح اندازہ کر کے اطلاع دیں۔ حضرت مسلم بن عقیل نے کوفہ پہنچ کر عوسجہ نامی ایک شخص کے گھر قیام کیا اور لوگوں سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لینی شروع کر دی۔ جلد ہی بارہ ہزار لوگوں نے خفیہ طور پر بیعت کر لی، جس پر انہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر جلد کوفہ پہنچنے کی گزارش کی۔ حضرت حسینؓ نے خط ملتے ہی کوفہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ادھر کوفہ کے نئے گورنر عبید اللہ بن زیاد کو حضرت مسلم بن عقیل اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بارے میں مخبری ہو گئی، چنانچہ چند سازشی عناصر کے ذریعے حضرت مسلم بن عقیل کو ہانی بن عروہ کے مکان سے گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا اور اہلِ کوفہ بزدلی، خوف اور بے بسی کی تصویر بنے، شہادت کا یہ روح فرسا منظر دیکھتے رہے۔

شہیدِ کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی

۳ ذی الحجہ ۶۰ ہجری بروز دوشنبہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے اہل و عیال اور خاندان کے ہم راہ کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اور یہ وہی دن تھا کہ جب حضرت مسلم بن عقیل کو ابن زیاد نے بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ اہلِ مدینہ اور صحابہ کرام نے آپ کو روکنے کی کوشش کی۔ اہلِ کوفہ کی بے وفائیاں اور شہادتِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ یاد دلائی، مگر آپ نے فرمایا میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تاکید کے ساتھ اس کام کو کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب یہ کام ضرور کروں گا، خواہ مجھے نقصان ہو یا فائدہ۔ لوگوں نے آپ سے خواب کی تفصیل جاننی چاہی، تو آپ نے فرمایا، میں نے یہ خواب کسی کو نہیں بتایا اور نہ بتاؤں گا، یہاں تک کہ اپنے پروردگار سے جا ملوں گا۔ (ابنِ اثیر، البدایہ والنہایہ)

ابھی آپ کوفہ کے راستے میں قادسیہ سے تین میل کے فاصلے پر تھے کہ حر بن یزید تمیمی سے سامنا ہوا، جو ایک ہزار افواج کے ساتھ آپ ہی کی تلاش میں تھا۔ یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا کہ جنھوں نے کوفہ آنے پر اصرار کیا تھا، لیکن اب یزید کے ساتھ تھا۔ وہ آپ سے ملا اور حضرت مسلم کی شہادت سمیت پوری روداد سناتے ہوئے واپس جانے کا مشورہ دیا، لیکن حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سن کر ان کے بھائیوں نے کوفہ جانے پر اصرار کیا، چنانچہ آپ نے سفر جاری رکھا۔ راستے میں کوفہ سے آنے والے لوگوں نے آگے نہ جانے کا مشورہ دیتے ہوئے بتایا کہ اہلِ کوفہ کے دِل تو آپ کے ساتھ ہیں، لیکن تلواریں یزید کے ساتھ ہیں۔

کربلا میں قیام اور شرائطِ امام

۲ محرم ۶۱ ہجری کو ایک مقام پر آپ نے قافلے کو روک کر اس جگہ کا نام دریافت کیا۔ بتایا گیا کہ اس جگہ کو کربلا کہتے ہیں۔ آپ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ یہی جگہ ہماری مقتل گاہ ہے۔ چنانچہ وہاں خیمے نصب کر دیے گئے، لیکن ابنِ زیاد کے حکم پر وہاں سے خیمے ہٹا دیے گئے اور دریائے فرات سے تین مِیل کی دوری پر صحرا میں لگا دیے گئے کہ جہاں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہ تھا۔

کربلا میں عمرو بن سعد ۴ ہزار فوجیوں کے ساتھ آپ کے محاصرے پر مامور تھا۔ اس وقت آپ کے خیموں میں معصوم شیر خوار بچوں، بیمار زین العابدین اور خواتین سمیت ۷۲ نفوسِ قدسیہ ذکرِ الٰہی میں مصروف تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عمرو بن سعد کے سامنے تین شرائط رکھیں:

(۱) مجھے واپس مکہ یا مدینہ جانے دیا جائے۔

(۲) کسی سرحدی مقام کی جانب نکل جانے دیا جائے۔

(۳) یزید کے پاس دمشق جانے دیا جائے تاکہ اپنے معاملات طے کر لوں۔

عمرو بن سعد نے شرائط ابن زیاد کو لکھ بھیجیں، لیکن اس نے یہ تینوں شرائط قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے حکم جاری کیا کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہ کو فوراً گرفتار کیا جائے یا پھر جنگ کر کے ان کا سر کاٹ کر بھیج دو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک سفاک شخص، شمر ذی الجوشن کو نیا سالار بنا کر بھیج دیا۔

یومِ عاشور اور خطابِ امامِ حسین رضی اللہ عنہ

سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ خیمے کے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ہلکی سی اونگھ آجاتی ہے۔ بیدار ہوتے ہیں، تو حسین چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح منور ہے۔ ہلکی سی مسکراہٹ نے فضا میں پھول بکھیر دیے ہیں۔ رفقا سے فرماتے ہیں کہ: ”مجھے میرے نانا جان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں آئے تھے۔ فرمایا کہ حسین! اب ہم سے ملنے کی تیاری کر لو“۔ راہِ حق کے متوالوں کی پوری رات عبادت میں گزری۔ صبح آپ نے یزیدی فوج کے سامنے

ایک پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کی۔

فرمایا: اے لوگو! تم جانتے ہو کہ میں رسول اللہ کا نواسہ، حیدرِ کرار کا نورِ نظر اور خاتونِ جنت کا لختِ جگر ہوں۔ تم واقف ہو کہ رسول اللہ نے ہم دونوں بھائیوں کو جنت کے نوجوانوں کا سردار بتایا ہے۔ تم سب نے مجھے خط لکھ کر بلایا، اب تم اپنے وعدوں سے پھر چکے ہو۔ میں ابھی بھی چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے جنگ نہ کرو اور مجھے اپنے رفقا سمیت مکہ یا مدینہ واپس جانے دو۔ اس تقریر سے متاثر ہو کر حر بن یزید تمیمی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

شمر ذی الجوشن نے جب یہ منظر دیکھا تو اسے فکر ہوئی کہ فوج میں بغاوت نہ ہو جائے، اس نے عمرو بن سعد سے کہا کہ اب دیر نہ کرو۔ عمرو نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی جانب پہلا تیر پھینک کر سانحہ کرب و بلا کا آغاز کیا۔ لشکرِ حسینی سے سب سے پہلے آپ کے ساتھیوں بریر ہمدانی، عابس شاکری، نافع بن ہلال، حبیب بن مظاہر اور دیگر نے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کی۔ اب اقربا کی باری ہے۔ عون، محمد، جعفر و قاسم، علی و عبداللہ غرض ایک ایک کر کے سب آتے رہے اور جنت کو سدھارتے رہے۔

شہادتِ امام عالی مقام

آخر میں لختِ جگر علی اکبر ہاتھ میں تلوار پکڑے آگے بڑھے۔ والدِ محترم کو مسکراتی نگاہوں سے الوداعی سلام کیا اور دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ خیموں سے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں، تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے جا کر فرمایا تمہارے رونے کی آوازوں سے یزید کے فوجی خوش ہوتے ہیں۔ سامنے ہی چھے ماہ کے علی اصغر لیٹے تھے، گود میں اٹھایا اور باہر آ کر کہا دیکھو! یہ معصوم تین دن سے پیاسا ہے ابھی الفاظ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ایک تیر آیا اور شیر خوار شہزادے نے باپ کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ اب حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ تنہا رہ گئے تھے۔ لشکرِ یزیدی نے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے آسمان کی جانب دیکھا، شمشیرِ حیدری کو داہنے ہاتھ میں پکڑا اور نعرہ تکبیر بلند کرتے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ ظلم ابنِ زیاد کا
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

شمشیرِ حسینی خوف زدہ فوجیوں کے سر قلم کرتی میدانِ جنگ میں چاروں جانب چل رہی تھی کہ اچانک کہیں دور سے اذان کی آواز آئی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ہاتھ روک لیا اور بآوازِ بلند نماز پڑھنے کی مہلت مانگی اور یہی وہ لمحہ تھا کہ جب شمر کے جوش دلانے پر مالک کندی نے دوشِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہہ سوار پر ایسا کاری وار کیا کہ تلوار کلاہِ مبارک کو کاٹتی ہوئی کاسہ سر تک پہنچ گئی۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور سارا بدن خون کے چھینٹوں سے لالہ احمر ہو گیا۔ آپ

نے زخمی سر مبارک پر دوسرا عمامہ باندھا۔ جیسے جیسے وقت گزر تا جا رہا تھا، ہزاروں کے حصار میں اکیلے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے جسمِ اطہر پر زخموں کے نشانات بڑھتے جا رہے تھے۔ زخموں کی شدت نے آپ کو نڈھال کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ شجاعت و بہادری کے اس کوہِ گراں کو شہید کر سکے۔ آخر شمر ملعون نے دھاڑ کر کہا آگے بڑھو اور شہید کر دو۔ یہ سنتے ہی آپ پر تیروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ایک تیر گردن پر پیوست ہو گیا، جسے آپ نے اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر نکالا۔ زرعہ بن شریک تمیمی نے زخموں سے چور، فاطمہ کے لال پر وار کیا۔ بایاں بازو کٹ کر دور جا گرا، عین اسی حالت میں سنان بن انس نے نیزا مارا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مقام زمین پر گر گئے۔ خولی بن یزید سر قلم کرنے آگے بڑھا لیکن ہاتھ کانپ گئے، پیچھے ہٹ گیا۔ سنگ دل اور شقی القلب سنان بن انس نے سر مبارک کو جسمِ اطہر سے جدا کر دیا۔ ابنِ زیاد کے حکم پر ان وحشی فوجیوں نے جسمِ اطہر کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے کہا۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

علامہ ابنِ جوزی نے تذکرۃ الخواص میں لکھا ہے کہ آپ کے جسمِ اطہر پر ۳۳ زخم نیزوں کے، ۴۳ تلواروں کے تھے، اور آپ کے پیرہن شریف پر ۱۲۱ سوراخ تیروں کے تھے۔ یہ تمام زخم جسمِ مبارک کے اگلے حصے میں تھے، پشت مبارک کی جانب کوئی زخم نہ تھا۔ (جامع التواریخ)

مردِ حق باطل سے ہرگز خوف کھا سکتا نہیں
سر کٹا سکتا ہے لیکن سر جھکا سکتا نہیں

بالآخر نواسہ رسول، جگر گوشہ بتول، ریحانۃ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میدانِ کربلا میں جامِ شہادت نوش پا گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تمہید

عہدِ نبوی میں خواتین کی ایک بڑی تعداد پیشہ ورانہ طور پر طب سے جڑی ہوئی تھی اور یہ خواتین طب کے مختلف شعبوں میں ماہر بھی تھیں، انھیں میں ایک نمایاں نام "حضرت سلمیٰ" رضی اللہ عنہا کا ہے، جو نبی کریم ﷺ کی آزاد کردہ باندی تھیں، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھرانہ کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا؛ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی آلِ بیتِ رسول ﷺ کی خدمت کا فریضہ انجام دیتی رہیں۔

یہ "دایہ گیری" کے شعبہ میں مہارت رکھتی تھیں، جسے آج کی زبان میں Midwifery کہا جاتا ہے، یہ ایک پیشہ ورانہ اور طبی شعبہ ہے، جس میں دایہ (Midwife) حاملہ خاتون کی دیکھ بھال، زچگی کے دوران مدد اور بچہ کی پیدائش کے بعد ماں اور نومولود کی نگہداشت کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ عام نرسنگ بھی کر لیا کرتی تھیں۔ آئیے! یہاں ہم ان کے تعلق سے جانتے ہیں۔

نام و تعارف

ان کا نام "سلمیٰ" ہے، یہ نبی کریم ﷺ کی آزاد کردہ باندی ہیں، ابتداء یہ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب کی باندی تھیں، انھوں نے نبی کریم ﷺ کو ہبہ کر دیا تو آپ ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا۔ محمد الحسون اور ام علی مشکور لکھتے ہیں:

سلمىٰ: مولاة رسول الله ﷺ، كانت أولاً مولاة لصفية بنت عبد المطلب، فوهبتها لرسول الله ﷺ، فأعتقه (أعلام النساء المؤمنات، ص: ٥١٥)

"سلمیٰ: رسول اللہ ﷺ کی خادمہ، یہ پہلے صفیہ بنت عبدالمطلب کی خادمہ تھیں، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا"۔

یہی وہ خاتون ہیں، جنھوں نے حضرت خدیجہؓ اور ماریہ قبطیہؓ کی ولادت کے موقع پر ان کا خیال رکھا اور ان کی دیکھ بھال کی۔ ابن سعد لکھتے ہیں: یہی وہ خاتون ہیں، جنھوں نے حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہونے والی نبی کریم ﷺ کی تمام اولاد کی پیدائش کے وقت ان کی دیکھ بھال کی اور دایہ گیری کا فریضہ انجام دیا، پہلے سے ہی ان کی ضروریات کا انتظام کر رکھتی تھیں، انھوں نے حضرت ماریہ قبطیہ کو بھی حضرت ابراہیم کی پیدائش کے وقت سنبھالا تھا (الطبقات الکبری: ۱۰/ ۲۱۶، نمبر شمار: ۴۹۸۷)۔

ازواج واولاد

حضرت سلمیٰ کا نکاح نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام "ابو رافع" کے ساتھ ہوا۔ ان کے نام کے سلسلہ میں کئی قول ہیں: (۱) ابراہیم (۲) اَسلم (۳) ہرمز (۴) ثابت (۵) سنان (۶) یسار (۷) صالح (۸) عبد الرحمٰن (۹) قزمان (۱۰) یزید؛ تاہم اسلم نام دیگر ناموں کی بہ نسبت زیادہ مشہور ہے۔

حافظ ابن عبد البر کہتے ہیں: وہو (اسلم) أشہر ما قیل فیہ "تمام ناموں میں "اسلم" زیادہ مشہور ہے"۔

یہ قبطی قوم سے تعلق رکھتے تھے، نبی کریم ﷺ کے پاس کیسے پہنچے؟ اس سلسلہ میں دو باتیں ملتی ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے یہ غلام تھے، انھوں نے آپ ﷺ کو ہبہ کر دیا؛ چنانچہ جب حضرت عباسؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تو انہی ابو رافع نے رسول اللہ ﷺ کو یہ خوش خبری سنائی، جس کی خوشی میں نبی ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا۔

(۲) یہ سعید بن العاص کے غلام تھے، جن کی وفات کے بعد ان بیٹے وارث بنے، یہ آٹھ یا دس تھے، ان میں سے بعض نے ابو رافع کو آزاد کر دیا، جب کہ بعض نے آزاد نہیں کیا تو یہ نبی کریم ﷺ کے پاس مدد کے لئے آئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے گفتگو کی تو ان لوگوں نے ابو رافع کو آپ ﷺ کو ہبہ کر دیا، پھر آپ ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا۔ ابو رافع کا انتقال صحیح قول کے مطابق حضرت علی کے دورِ خلافت میں ہوا۔

حضرت سلمیٰ کے بطن سے حضرت ابو رافع کا ایک لڑکا: عبید اللہ بن أبي رافع پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے والد اور حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے اور یہ حضرت علی کے کاتب تھے (الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ص: ۹۱۲، نمبر شمار: ۳۳۴۶/ ص: ۸۰۵، نمبر شمار: ۲۹۲۵/ ص: ۶۰، باب اسلم، نمبر شمار: ۷۳، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۵/ ۳۸، نمبر شمار: ۳۸۰۵)۔

اسلام اور غزوات میں شرکت

یہ بات ابھی گزر چکی ہے کہ حضرت سلمیٰؓ نے حضرت خدیجہ کی ساری اولاد کی دایہ گیری کی ہے تو اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ابتدائی دور میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا، یہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ بھی گئیں اور پھر

خصوصیت کے ساتھ غزوۂ خیبر میں انھوں نے شرکت بھی کی۔

ابن سعد لکھتے ہیں: وقد شهدت سلمىٰ خيبر مع رسول الله ﷺ (الطبقات الکبری: ۱۰/۲۱۶، نمبر شمار: ۴۹۸۷)"سلمیٰ غزوۂ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک تھیں"۔

غزوۂ حنین میں بھی شرکت کا ذکرہ ملتا ہے؛ چنانچہ شیخ محمد صادق کرباسی لکھتے ہیں: ویذکر أنها شهدت وقعة حنین سنة ۸ ھ (معجم أنصار الحسین، ص:۸۴)"ذکر کیا جاتا ہے کہ آٹھ ہجری میں انھوں نے غزوۂ حنین میں شرکت کی ہے"۔

طبابت

یہ دایہ گیری اور ڈیلوری کرانے میں مہارت تو رکھتی ہی تھیں، ساتھ میں نرسنگ بھی کیا کرتی تھیں، محمد الحسون لکھتے ہیں:

> وہی قابلة وممرضة ... وهي التي كانت تقبل فاطمة الزهراء سلام الله عليها في نفاسها وتمرضها، وقيل: إنها مرضتها في مرضها التي توفيت فيه (أعلام النساء المؤمنات، ص: ۵۱۵).

> ”وہ ایک دایہ اور نرس تھیں... انھوں نے ہی حضرت فاطمہ زہراءؓ کے نفاس کے دوران ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی تھی، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کی تیمارداری ان کے مرض الوفات میں کی تھی“۔

ڈاکٹر حسین فلاح کساسبہ لکھتے ہیں:

> ومنهن من مارست مهنة التوليد كسلمى مولاة صفية بنت عبد المطلب التي قبلت مارية قبطية حينما ولدت إبراهيم (Educational & Social Science Journal, Vol:6(1) January 2019، عنوان: الطب والأطباء في صدر الاسلام للدكتور حسين فلاح الكساسبة، ص: ۶۸۲)۔

> ”ان میں بعض ایسی بھی تھیں، جو زچگی اور ولادت کے پیشے سے وابستہ تھیں، جیسے: سلمیٰ، جو صفیہ بنت عبد المطلب کی آزاد کردہ باندی تھیں، انھیں کی نگرانی میں ماریہ قبطیہ نے حضرت ابراہیم کو جنم دیا“۔

ڈاکٹر امیمہ ابوبکر اور ڈاکٹر ہدی سعدی نے انھیں "جراحة حروب"(Battlefield Surgeon) قرار دیا ہے، جسے اردو میں "جنگی جراح" یا "میدان جنگ کا سرجن" کہہ سکتے ہیں (النساء ومهنة الطب في المجتمعات الاسلامية، ص:۱۹)۔

اس تعلق سے خود ان کی حدیث ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

ما كان يكون برسول الله ﷺ قرحة ولانكبة؛ إلا أمرني رسول الله ﷺ أن أضع عليها الحناء (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ٢٠٥٤، قال أبوعيسى: هذا حديث حسن غريب).

"رسول اللہ ﷺ کو جب بھی کوئی زخم یا چوٹ لگتی تو مجھے مہندی لگانے کا حکم فرماتے"۔

کیوں کہ زخم پر مہندی لگانے کے کئی فائدے ہوتے ہیں:

(۱) مہندی میں اینٹی بیکٹیریل اور اینٹی فنگل خصوصیات ہوتی ہیں، جو زخم کو انفیکشن سے بچانے میں معاون ہوتی ہیں۔

(۲) مہندی قدرتی طور پر ٹھنڈک پہنچاتی ہے، جس کی وجہ سے آرام دہ اثر محسوس ہوتا ہے۔

(۳) اس کے اندر اینٹی انفلیمیٹری خصوصیات ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے زخم کے درد اور سوجن میں کمی واقع ہوتی ہے۔

(۴) یہ قدرتی اینٹی سیپٹک ہے، یہی وجہ ہے کہ جڑی بوٹیوں کے علاج میں اسے استعمال کیا جاتا ہے؛ تاکہ جلدی بیماریوں اور زخموں کو جلد ٹھیک کیا جا سکے، انھیں وجوہات کی بنا پر نبی کریم ﷺ زخموں پر مہندی لگانے کی تاکید فرماتے تھے۔

وفات

ان کی وفات کس سن میں ہوئی؟ اس سلسلہ میں زیادہ تر کتابوں میں کوئی ذکر نہیں ہے؛ البتہ محمد صادق کرباسی نے ان کی سن وفات ۲۰ھ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: قد توفيت سنة ٢٠ھ (معجم أنصار الحسين: ٢/ ٩٥) "ان کی وفات سن بیس (۲۰) ہجری میں ہوئی"۔

رضي الله عنها وأرضاها، وجعل مثواه برداً وسلاماً۔

خواتین کا
مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

سوالات:

۱. عورتوں کے لیے مسجدوں میں جاکر نماز پڑھنا افضل ہے یا اپنے گھروں میں؟ اگر عورتوں کا اپنے گھروں میں نماز پڑھنا افضل ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں مسجد کی نماز میں کیوں شریک ہوتی تھیں؟

۲. جن احادیث میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے افضل یہی ہے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، ان سے یہ استدلال کرنا کہ شریعت اس بات کو پسند کرتی ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں ہی ٹک کر رہیں اور باہر نکلنے سے پرہیز کریں کس حد تک درست ہے؟

۳. رسول اللہ کے زمانے میں بھی اور آج بھی جو عورت باجماعت نماز کے لیے مسجد جاتی ہے کیا اس کے مقابلہ میں گھر میں رہ کر نماز پڑھنے والی خاتون زیادہ افضل کام کرتی ہے اور زیادہ اجر کی مستحق ہوتی ہے؟

جواب:

تمام احادیث کو سامنے رکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اصولاً خواتین کے لیے، احتیاطی آداب کی پابندی کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز میں شرکت کی گنجائش واضح فرمائی اور صحابہ کو انھیں اس سے روکنے سے منع فرمایا، اور دوسری طرف شخصی سطح پر خواتین کو ترغیب دی کہ وہ اگر گھر میں ہی نماز ادا کریں تو یہ زیادہ باعث اجر ہے۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کی شریعت سے امتیاز قائم ہو جائے جس میں خواتین کا عبادت گاہ کے مرکزی حصے میں جانا ممنوع ٹھہرایا گیا تھا۔ یعنی قانون یہ نہ سمجھا جائے کہ خواتین مسجد میں نہیں آسکتیں، البتہ انفرادی طور پر

گھر میں نماز ادا کرنے کی فضیلت واضح کی گئی تاکہ ایک تو سبھی خواتین باجماعت نماز کا التزام نہ شروع کر دیں اور دوسرا جو گھر میں پڑھنا چاہیں، انھیں یہ احساس نہ ہو کہ وہ زیادہ اجر سے محروم ہو رہی ہیں۔

مذکورہ وضاحت سے یہ سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ شریعت کی نظر میں خواتین کی صنفی نزاکتوں اور گھریلو ذمہ داریوں کے پیش نظر گھر میں عبادت افضل ہونے کے باوجود اگر ان کے لیے مسجد میں آنے جانے کی اجازت کو اصولاً قائم رکھا گیا ہے اور کئی ظاہری موانع کے باوجود اس کو ختم نہیں کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کو گھر تک محدود رکھنا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ تمدن کے لحاظ سے جو بھی عمومی سماجی ضرورتیں اور تقاضے ہوں، ان کے لیے بیرون خانہ سرگرمیاں بھی وہی حیثیت بلکہ ان سے زیادہ عملی ناگزیریت رکھتی ہیں جو مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی ہے۔

جہاں تک گھر میں یا مسجد میں نماز کے افضل ہونے کا تعلق ہے تو کسی عمل کی افضلیت کوئی مطلق چیز نہیں ہوتی، بلکہ مختلف حالات میں مختلف امور کے لحاظ سے اضافی ہوتی ہے۔ مثلاً جہاد ایک بہت افضل عمل ہے، لیکن اگر والدین خدمت کے طلبگار ہوں تو ان کی خدمت زیادہ افضل ہے۔ خواتین کی نماز کو گھر میں افضل قرار دینے میں بھی کئی امور کا لحاظ ہے، مثلاً راستے میں یا مسجد میں مردوں کے لیے مرکز نگاہ بننے کا امکان اور گھر کی ذمہ داریوں میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ وغیرہ۔ ان پہلوؤں سے عورت کا گھر میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ لیکن اگر عبادت گاہ کے تقدس، باجماعت نماز کے اجر اور مسجد میں درس اور وعظ وغیرہ سننے کے پہلوؤں کو مدنظر رکھا جائے تو مسجد میں عبادت کرنا زیادہ موجب فضیلت ہے۔

ان دونوں پہلوؤں میں ترجیح خواتین کی صورت حال کے لحاظ سے قائم ہو سکتی ہے۔ اگر خواتین کی گھریلو ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں، مسجد آنے جانے میں کوئی عملی مشکل حائل نہ ہو اور مسجدوں میں بھی ان کے لیے کوئی الگ جگہ مخصوص کر دی گئی ہو تو ان کے لیے مسجد میں باجماعت نماز کا اجر حاصل کرنا زیادہ افضل ہوگا۔ اگر مذکورہ موانع میں سے کوئی مانع پایا جاتا ہو تو پھر خود کو یا اہل خانہ کو کسی مشکل میں ڈالنے کے بجائے گھر میں ہی نماز ادا کرنا زیادہ باعث فضیلت ہوگا۔ حدیث میں دراصل انھی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے خواتین کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ عام حالات میں گھروں میں ہی نماز ادا کر لیا کریں تو اس کا انھیں زیادہ اجر ملے گا۔

بعض خطیب حضرات جمعہ کے دن تقریر، خطبہ اور نماز کے دوران مسجد کا بیرونی لاؤڈ اسپیکر استعمال کرتے ہیں، جس کی آواز دور دراز تک پہنچتی ہے، جس کی وجہ سے جہاں ایک طرف نماز و خطبہ کی بے احترامی لازم آتی ہے، وہاں دوسری طرف معذور، مریضوں اور ہمارے بوڑھے حضرات کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔ یہی صورتِ حال سیاسی اور مذہبی جلسوں میں بھی عام طور پر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے کوئی شخص اپنے گھر میں آرام سے نہ سو سکتا ہے، نہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کوئی اور کام کر سکتا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان کی آواز دور [متعلقہ لوگوں] تک پہنچانا برحق ہے، لیکن مسجدوں میں جو وعظ و نصیحت، تقریر و بیان یا خطبہ اور ذکر و تلاوت لاؤڈ اسپیکر پر ہوتی ہے، ان کی آواز دور دور تک اور گھر گھر تک پہنچانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مسجد میں بہت تھوڑے لوگ تقریر و بیان سننے کے لیے بیٹھے ہیں، جن کو آواز پہنچانے کے لیے لاؤڈ اسپیکر کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے، یا صرف اندرونی مائیک سے بآسانی کام چل سکتا ہے، لیکن بیرونی لاؤڈ اسپیکر پوری قوت سے کھلا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ آواز محلے کے گھر گھر میں اس طرح پہنچتی ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خاص کر جب ایک ہی وقت میں مختلف مسجدوں کے بیرونی لاؤڈ اسپیکر استعمال ہوتے ہیں تو ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے ٹکرانے کی وجہ سے جو شور و شغب پیدا ہوتا ہے، آس پاس رہنے والے لوگ اذیت اور بے چینی کے عالم میں رہتے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی آواز کو صرف ضرورت کی حد تک محدود رکھا جائے اور آس پاس کے ان ضعیفوں اور بیماروں پر رحم کیا جائے جو یہ آواز سننا نہیں چاہتے۔

پھر خطبہ و نماز کے دوران اسپیکر استعمال کرنے کا شریعت نے کوئی حکم بھی نہیں دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک سہولت اور انتظامی ضرورت کی چیز ہے، لہٰذا اس کا استعمال صرف بوقتِ ضرورت بقدرِ ضرورت کیا جائے، اس سے آگے نہیں۔ جن حضرات کو اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہو، ان کی خدمت میں کچھ اہم نکات عرض کیے دیتا ہوں۔

(1) مشہور محدث حضرت عمر بن شبہؒ نے مدینہ منورہ کی تاریخ پر چار جلدوں میں بڑی مفصل اور محقق کتاب لکھی ہے، جس کا حوالہ بڑے بڑے علما و محدثین ہمیشہ دیتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک واقعہ اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک واعظ صاحب حضرت عائشہؓ کے مکان کے بالکل سامنے بہت بلند آواز سے وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ زمانہ لاؤڈ اسپیکر کا نہیں تھا، لیکن ان کی آواز بہت بلند تھی اور اس سے حضرت عائشہؓ کی یکسوئی میں فرق آتا تھا۔ یہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، اس

لیے حضرت عائشہؓ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ ایک صاحب بلند آواز سے میرے گھر کے سامنے وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں، جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، کسی اور کی آواز مجھے سنائی نہیں دیتی۔ حضرت عمرؓ نے ان صاحب کو پیغام دے کر انہیں وہاں وعظ و نصیحت کرنے سے منع کر دیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد اس نے دوبارہ وعظ کا وہی سلسلہ شروع کیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے خود جاکر ان صاحب کو پکڑا اور ان پر تعزیری سزا جاری کی۔ (أخبار المدینۃ لعمر بن شیبہ/1/15/)

بات صرف اتنی نہیں تھی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنی تکلیف کا ازالہ کرنا چاہتی تھیں، بلکہ دراصل وہ اسلامی معاشرت کے اصول کو واضح اور نافذ کرنا چاہتی تھیں کہ کسی کو کسی سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ نیز یہ بتانا چاہتی تھیں کہ وعظ و نصیحت، بیان و تقریر اور دین کی دعوت و تبلیغ کا پُروقار طریقہ کیا ہے۔

(2) حضرت عطاء بن ابی رباحؒ بڑے اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں۔ علمِ تفسیر و حدیث میں ان کا مقام مسلّم ہے۔ ان کا مقولہ ہے کہ: عالم کو چاہیے کہ اس کی آواز اس کی اپنی مجلس سے آگے نہ بڑھے۔ (أدب الاملاء والاستملاء للسمعانی/5)

(3) فقہائے کرامؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر کی چھت پر بلند آواز سے تلاوت کرے، جبکہ لوگ سو رہے ہوں تو تلاوت کرنے والا گناہ گار ہو گا۔

وعلی ھذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم۔ (رد المحتار: کتاب الصلاۃ/329/2/ط: رشیدیہ)

اس کے علاوہ فقہائے کرامؒ نے بغیر لاؤڈ اسپیکر کے بھی امام کو اپنی آواز میں اعتدال رکھنے کا حکم دیا ہے۔

الاِمام اِذا جھر فوق حاجۃ الناس فقد أساء۔ (البحر الرائق: کتاب الصلاۃ/آداب الصلاۃ/1/637/ط: دار إحیاء التراث العربي)

بیرونی بڑے اسپیکر کی آواز سے قریب کے آس پاس بسنے والے حضرات میں سے خاص کر خواتین، بوڑھوں، مریض اور معذوروں کو نماز پڑھنا، ذکر و تلاوت اور دیگر عبادات ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے، جس کا مشاہدہ ہم کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے اکثر و بیشتر مقامات پر آس پاس رہنے والے لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے، مگر وہ بیچارے شرما شرمی میں زبان سے مسجد کے متعلقہ افراد سے اظہار نہیں کر سکتے۔

ظاہر ہے کسی نماز یا دیگر عبادات میں خلل ڈالنا گناہ ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ یہ اور اس جیسی دیگر خرابیوں اور فسادات کی وجہ سے نماز اور خطبہ کے دوران بیرونی لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔ وعظ و نصیحت اور خطبہ و نماز وغیرہ کی آواز کو ضرورت کی حد تک محدود رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کسی بات کو سننا، اس پہ غور کرنا اور حق بات کو قبول کرنا، اس میں رکاوٹ سات آٹھ چیزیں ہوتی ہیں۔ اور وہ سات آٹھ چیزیں اس سوشل میڈیا سے نہ صرف پیدا ہوتی ہیں بلکہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہیں۔ وہ سات آٹھ چیزیں کیا ہیں؟

ایک تو آپ دیکھیں جو عصبیت ہمارے ہاں چل رہی ہے، تو عصبیت سوشل میڈیا سے بہت زیادہ بڑھتی ہے۔ اور عصبیت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جب آپ کسی تعصب میں مبتلا ہو جائیں، چاہے وہ قوم پرستی کا تعصب ہو، یا صوبائیت کا تعصب ہو، یا زبان کا ہو، یا کسی خانقاہ کا ہو، یا حتیٰ کہ کسی مذہب کا بھی ہو؛ کیونکہ عصبیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حق بات کا انکار کرنا اپنی قوم کی وجہ سے، اور غلط بات کی تائید کرنا اپنی قوم کی وجہ سے؛ اگر مسلمان ہونے کی وجہ سے، اسلام کی وجہ سے آپ اقلیتوں پر ظلم کر رہے ہیں، یہ بھی اسلامی مذہبی عصبیت ہے، جائز نہیں ہے، یہ بھی حرام ہے۔ اگر آپ اپنی خانقاہ کی وجہ سے کسی صحیح بات کا انکار کر رہے ہیں، یہ بھی عصبیت ہے۔ تو ایک عصبیت ہے۔

دوسری عقیدت، جب عقیدت اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے اور اندھی عقیدت جسے کہتے ہیں، اور اندھی عقیدت کیسے ہوتی ہے کہ کسی چیز کو مسلسل آپ دیکھ رہے ہیں، مسلسل اس کو پڑھ رہے ہیں، مسلسل اس کو شیئر کر رہے ہیں، اس کو لائک کر رہے ہیں، اس کو آگے لوگوں تک پہنچا رہے ہیں؛ ایسی اندھی محبت، کسی سے عشق اور محبت جب ہو جاتی ہے تو وہ آدمی اس کے خلاف سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں نا کہ نوجوان سن ہی نہیں رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا نے ہمیں اندھی عقیدت میں بھی مبتلا کر دیا ہے، ہمیں اندھی محبت میں بھی مبتلا کر دیا ہے، ہمیں عصبیت میں مبتلا کر دیا ہے، اور ہمیں ضد اور ہٹ دھرمی میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔

اور اسی طریقے سے ایک پانچویں چیز ہے، جب آپ کسی چیز کو مشن بنا لیتے ہیں، زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں کہ مجھے یہی کام کرنا ہے، رات دن یہ کام کرنا ہے۔ تو جو آدمی ایک مشنری بن جاتا ہے، اس کے بعد پھر کسی اور کی بات سننا اس کے

لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔

پھر ان سب کے ساتھ جذباتیت، جب آدمی جذبات میں آجاتا ہے تو جذباتی ہو کر پھر کسی بات کو دھیان سے سن لے، غور کرے، یہ نہیں کر سکتا۔ جذباتیت کے ساتھ پھر سطحیت، کہ ریسرچ نہیں ہے، تحقیق نہیں ہے، سنی سنائی باتیں ہیں، اور اس کو آپ لے کر چل رہے ہیں۔ تو جذباتیت کو چھٹے نمبر پر ملا لیں، پھر سطحیت کو ملا لیں۔

اس کے ساتھ ساتھ عدمِ برداشت۔ یہ سوشل میڈیا آدمی کو برداشت سے باہر نکال دیتا ہے۔ آپ دیکھیں چھوٹے چھوٹے بچے، وہ کتنی ضد کر رہے ہوتے ہیں، یہ سوشل میڈیا کے وہ اثرات ہیں۔

تو سوشل میڈیا کے ان سات اثرات نے، سات چیزوں نے ہمیں وہاں تک پہنچا دیا ہے کہ ہم نہ کسی حق بات کو سننے کے قابل رہے ہیں، نہ اس پہ غور کر سکتے ہیں، نہ ہم اس کو قبول کر سکتے ہیں۔ تو سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ ان ساتوں چیزوں سے ہم بچنے کی کوشش کریں۔

اور اگر ان سات چیزوں کے ساتھ آپ اس کو بھی ملا لیں کہ ہمارے ملک میں حکومت کی رِٹ نہیں ہے۔ صوبائی حکومتیں ہوں، مرکزی حکومت ہو، بیوروکریسی ہو، پولیس کا محکمہ ہو، یا ہمارا میڈیا ہو، تو وہ جس طریقے سے چل رہے ہیں اس کی روشنی میں یہ ہر بیماری اتنی آگے [چلی جاتی ہے] پھر اس کو ضرب دیتے چلے جائیں۔

اس لیے ہمیں اپنا خیال رکھنا چاہیے اور جیسے مولانا عبد الودود صاحب نے کہا کہ نعمت تو بہت بڑی ہے لیکن اس کی کوئی ضمانت ہے کہ تمہارے پاس یہ نعمت رہے گی؟ اگر ہم ناشکری کریں گے اور ان چیزوں میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس نعمت کو چھین نہ لے۔

قرآن مجید میں آتا ہے ”وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم، ثم لا یکونوا امثالکم“ کہ اگر تم باز نہیں آئے تو اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو لے آئیں گے جو تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔ دو شکلیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے:

- ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نعمت کو چھین کر کسی اور کو دے دیتے ہیں۔
- اور دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نعمت سے بالکل محروم کر دیتے ہیں، کسی اور کو بھی نہیں دیتے۔

آپ دیکھیں کہ اندلس میں چھ سات سو سال ہماری حکومت رہی، خلافت رہی، آج وہاں کھنڈرات ہیں، کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ تو ہمیں اس سے ڈرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کہیں ہم سے یہ نعمت نہ چھین لے۔

تو اس میں، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مولانا طارق مسعود صاحب نے جو سوشل میڈیا کی بات کی، تو سوشل میڈیا، جب یہ چیز ہمارے ملک میں آئی، یا جب اس کو لایا گیا، تو جنرل مشرف کے بارے میں بہت سارے لوگ باتیں کرتے ہیں نا، تو میرے ذہن میں جو انہوں نے بہت بڑا اس ملک کا نقصان کیا، وہ یہ کہ یہ میڈیا لے کر آئے اور پورے کا پورا لے لیا انہوں

نے۔ اس کے لیے یہ منصوبہ بندی نہیں کی کہ یہ آئے گا تو اس کے لیے کیا ہمیں بندوبست کرنا ہوگا، اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اگر گاڑی آپ لے رہے ہیں اور اس گاڑی میں بریکیں ہیں ہی نہیں، اور گیئر بھی پانچ ہی کا لگ رہا ہے، تو پھر آپ تباہ کریں گے، گاڑی بھی تباہ ہوگی، آپ بھی تباہ ہوں گے اور لوگ بھی تباہ ہوں گے۔

تو جب یہ چیز آرہی تھی، میڈیا، اس وقت ہمارے اداروں کو، ان لوگوں کو، ہماری حکومتوں کو، اس پہ سوچنا چاہیے تھا کہ اس کو کتنا لینا ہے اور کتنا نہیں لینا، اور جتنا لینا ہے اس کو بہتر کیسے استعمال کرنا ہے۔

تو میرے خیال میں اگر سو بیماریوں کی ایک بیماری ہم کہیں تو آج کے زمانے میں یہ سوشل میڈیا کا فتنہ، جس طریقے سے ہم استعمال کر رہے ہیں، فتنہ کا مطلب ہے کہ اس کا غلط استعمال۔ اگر اسی کا آپ حب الوطنی کے لیے استعمال کریں، اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے آپ استعمال کریں، اللہ کا شکر کرنے کے لیے آپ استعمال کریں، عصبیت کو ختم کرنے کے لیے آپ اس میڈیا کو استعمال کریں تو یہی چیز ہمارے ملک کے لیے نجات دہندہ بھی بن سکتی ہے۔

https://youtu.be/7mGz3i7xaeQ

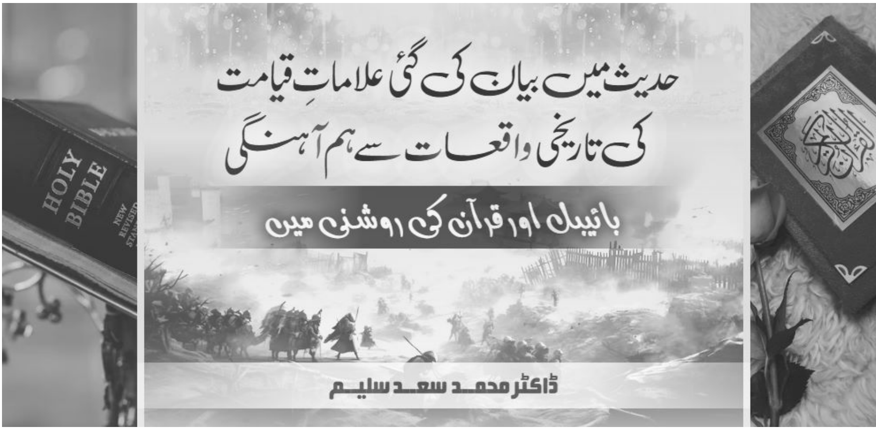

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول — مسیح کی آمد

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ دیگر پیشگوئیوں کی طرح، اِس نزول کو علامتی طور پر ایک ریاست سمجھا گیا ہے۔ یہ علامتی تشریح کتاب دانیال میں پیش کیے گئے رویا سے مطابقت رکھتی ہے، جہاں بابل کی سلطنت کے آخر کے دَور کو ایک انسان سے تشبیہ دی گئی ہے۔[142]

یہ ریاست، انسانیت کے نجات دہندہ یا خدا کی طرف سے 'چنے گئے'، یعنی ایک مسیح کی مانند، یاجوج وماجوج کے مابین عظیم معرکے میں ایک فیصلہ کُن کردار ادا کرتی ہے۔ جرمنی کی فاشسٹ ریاست کے نتیجے میں یورپی اقوام کا ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا، جسے سورۂ کہف[143] میں صور پھونکنے سے پہلے یاجوج اور ماجوج کے "ایک دوسرے پر موجوں کی طرح ٹکرانے" سے تعبیر کیا گیا ہے، اِسی ہولناک تصادم کی عکاسی کرتا ہے۔

مزید برآں، یہ ریاست دجال (جھوٹے مسیحا)، یعنی سوویت یونین، کے خلاف بھی صف بندی کرتی ہے — وہ طاقت جو انسانیت کو مصائب سے نجات کے جھوٹے وعدے دیتی رہی، مگر درحقیقت یہ الحاد، ریاستی ظلم وستم اور مذہبی جبر کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی۔ دوسری جنگِ عظیم سے لے کر سرد جنگ کے اختتام تک، امریکہ نے اِس پس منظر میں اِس علامتی کردار کو ادا کیا۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی کا دائرۂ کار حدیث میں بیان کیا گیا ہے، جہاں اُن کے دجال سے جنگ کرنے اور یاجوج وماجوج کا مقابلہ کرنے کا ذکر ہے۔ ہمیں اپنی توقعات کو اِنہی واقعات تک محدود رکھنا چاہیے، جو احادیث میں بیان کیے گئے ہیں، کیونکہ یہ واپسی حقیقی معنوں میں نبی کی واپسی نہیں بلکہ ایک علامتی مظہر ہے۔ اگر دوسری جنگِ عظیم اور سرد جنگ کے دوران امریکہ ایک عالمی طاقت کے طور پر نمایاں کردار ادا نہ کرتا، تو دنیا سائنسی ترقی اور

جغرافیائی سیاست کے تناظر میں نہایت خوفناک حد تک مختلف ہوتی، کیونکہ فاشسٹ اور کمیونسٹ ریاستوں کا تسلط عالمی حالات کو شدید متاثر کر سکتا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسمانی نزول کے خلاف دلائل

اِس مضمون کا مقصد یہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو جسمانی یا علامتی طور پر ثابت کیا جائے۔ معروف اسلامی اسکالر جاوید احمد غامدی نے اِس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔[144]

قرآن سے دلائل

جاوید احمد غامدی کے دلائل، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسمانی نزول کے خلاف ہیں، کئی قرآنی حوالوں پر مبنی ہیں:

قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی تفصیل: قرآن، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو بیان کرتا ہے —اِن کی معجزاتی پیدائش سے لے کر اِن کی وفات، رفع اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے تک۔ تاہم، قرآن میں قیامت سے پہلے اِن کے نزول کا کوئی ذکر نہیں ملتا، جو جسمانی نزول کے تصور کے خلاف ایک اہم دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور رفع کا ذکر: قرآن واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب سے بچانے[145] اور اِن کی وفات کے بعد اِن کے رفع[146] کرنے کا واضح بیان موجود ہے۔

رفع کے بعد الوہیت کی لاعلمی: سورۂ المائدہ[147] میں قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اُنھوں نے کبھی لوگوں کو اپنی یا اپنی والدہ (علیہا السلام) کی عبادت کا حکم نہیں دیا۔ وہ مزید واضح کرتے ہیں کہ اِن کے رفع کے بعد انسانوں کے اعمال کا گواہ اللہ ہے، اور اُنھیں اِن کے بعد کے حالات کا علم نہیں تھا۔

یہ لاعلمی اِس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ زمین پر واپس نہیں آئے تاکہ اِن واقعات کا مشاہدہ کر سکیں۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ یہ بیان صرف اُن لوگوں کے لیے تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں موجود تھے۔ تاہم، تاریخی شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت مریم (علیہا السلام) کو الٰہی حیثیت دینے کا واقعہ 431ء میں مجمعِ افسس (Council of Ephesus) میں پیش آیا، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کے صدیوں بعد کا واقعہ ہے۔

عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں اُن کی والدہ (علیہا السلام) کو الٰہی حیثیت میں نہیں پوجا گیا تھا، اور یہ تصور بعد میں ارتقا پذیر ہوا۔ یہ حقائق اِس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا، وہ صرف اُن کے رفع سے پہلے کے پیروکاروں تک محدود نہیں بلکہ اُن کے بعد آنے والے تمام عیسائیوں کے لیے

بھی متعلق ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات اور رفع کے بعد اِس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔

جسمانی نزول کے خلاف اسلامی علما کی آرا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جسمانی واپسی پر بھی کئی علما نے سوال اُٹھائے ہیں۔ اِن میں سے کچھ آرا یہاں بیان کی جا رہی ہیں:[148]

- مولانا محمود حسن (مشہور حنفی اسکالر) — اِنھوں نے اِن احادیث کو یہودی روایات سے متاثر قرار دیا اور اِن کی صداقت پر تنقید کی۔
- مولانا عبید اللہ سندھی — اِن کے مطابق یہودیوں نے اِن احادیث کو مسلمانوں کے غلبے کو کمزور کرنے کے لیے گھڑا۔
- علامہ محمود شلتوت (مصری اسکالر) — اِنھوں نے اِن احادیث کو تنقیدی نظر سے پرکھا اور اِن کی صداقت پر سوال اُٹھایا۔
- مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی — اِنھوں نے اِن احادیث کو ختمِ نبوت کے اصول سے متصادم قرار دیا۔
- مولانا ابوالکلام آزاد — اِن کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اُسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب قرآن اِس کا واضح طور پر ذکر کرے۔
- علامہ محمد اقبال — اِنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور مہدی کے تصور کو اسلام سے باہر کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا۔
- قمر احمد عثمانی (دیوبندی عالم) — اِنھوں نے ختمِ نبوت کے اصول کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے امکان کے منافی قرار دیا۔

عمومی غلط فہمی کا ازالہ

سورۂ النساء، آیت 159:

"اِن اہلِ کتاب میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے لازماً اِسی (قرآن) پر یقین کر لے گا اور قیامت کے دن یہ اِن پر گواہی دے گا۔"

یہ آیت اکثر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسمانی نزول کے حق میں پیش کی جاتی ہے۔

تاہم، اِس آیت کا سیاق و سباق واضح کرتا ہے کہ یہ حضرت محمد صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے وقت کے اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔ یہ ایک انتباہ کے طور پر پیش کی گئی ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ اہلِ کتاب اپنی موت سے پہلے قرآن کو اللہ کی کتاب

کے طور پر تسلیم کریں گے، چاہے وہ اِس کا اقرار نہ کریں۔ قیامت کے دن یہ اعتراف اُن کے خلاف شہادت کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

صحیح احادیث کا علامتی مفہوم

اِس مضمون میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق صحیح احادیث کو مستند تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اِن احادیث میں بیان کردہ قیامت سے پہلے کے واقعات کو جسمانی واپسی کے بجائے تشبیہات کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال کے واقعات

اس مضمون میں دجال کے لیے ایک علیحدہ باب مختص کیا گیا ہے؛ چنانچہ اس حصے میں دجال کی صرف وہی تفصیلات شامل کی گئی ہیں جو سابقہ باب میں بیان نہیں ہوئیں۔

نزول کا منظر

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی عیسیٰ علیہ السلام زعفرانی لباس میں ملبوس، اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے زمین پر اتریں گے۔ جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے شبنم کی مانند قطرے ٹپکیں گے، اور جب سر اٹھائیں گے تو ان سے موتیوں کی طرح شبنم کے قطرے جھڑیں گے۔ [149]

یہاں فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھ کر نزول اُن عوامل کی علامت ہے جو امریکہ کو دوسری جنگ عظیم میں لے آئے —جن میں جاپان کا امریکہ پر حملہ اور جرمنی و اٹلی کی جانب سے اعلانِ جنگ شامل ہیں۔ ان واقعات کے بعد امریکہ نے اپنی تنہائی پسندانہ پالیسی ترک کرتے ہوئے عالمی سطح پر عملی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح، نبی عیسیٰ علیہ السلام کے سر جھکانے اور پھر اٹھانے کے ساتھ پسینے کے موتیوں کی طرح بکھرنے کا منظر، دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کی باوقار شمولیت کی علامت ہے، جبکہ زعفرانی لباس امریکہ کی اقتصادی عظمت اور بے پایاں وسائل کا استعارہ ہے۔

دجال کا نوجوان کو قتل کرنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دمشق میں نزول— دوسری جنگ عظیم میں نومبر 1942ء کے واقعات

حدیث کے مطابق دجال ایک نوجوان کو قتل اور پھر زندہ کرے گا، اور وہ خوشی سے ہنستا ہوا واپس آئے گا، اور اسی وقت اللہ عیسیٰ علیہ السلام کو مشرقی دمشق میں سفید مینار پر نازل کرے گا۔ [150]

جیسے پہلے بیان کیا گیا، دجال کا لوگوں کو قتل کرنا اور پھر انہیں دوبارہ زندہ کرنا در حقیقت کمیونسٹ انقلابات کی علامت ہے، جہاں طاقت کے ذریعے سابقہ حکومتوں کا تختہ الٹایا جاتا ہے اور ان کی جگہ نئی حکومتیں قائم کی جاتی ہیں۔ یہ نوجوان یوگوسلاویہ کی نمائندگی کرتا ہے، جو 1918 میں قائم ہوا اور 1929 میں سلطنت یوگوسلاویہ کے طور پر جانا گیا۔ دوسری

جنگ عظیم کے دوران یوگوسلاویہ میں جرمن حملے کے بعد کمیونسٹ تحریک نے زور پکڑا۔ نومبر 1942 میں، کمیونسٹوں نے یوگوسلاویہ کی آزادی کی تحریک کو منظم کرنے کے لیے اینٹی فاشسٹ کونسل برائے قومی آزادی (AVNOJ) کی بنیاد رکھی, جس نے اس وقت یوگوسلاویہ کے کچھ علاقوں پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ قابلِ ذکر ہے کہ یوگوسلاویہ کے کئی علاقوں نے نئے کمیونسٹ اقتدار کو رضاکارانہ طور پر قبول کیا، جو اُس نوجوان کی خوشی سے واپسی کی مانند ہے جسے "قتل" کیا گیا اور پھر "زندہ" کیا گیا۔

اسی دوران، نومبر 1942ء میں، امریکہ نے اتحادی افواج کے ساتھ مل کر اپنا پہلا بڑا زمینی آپریشن —آپریشن ٹارچ — شروع کیا۔ حدیث میں مذکور "مینار" عام طور پر کسی خطے میں مسلم آبادی اور اسلامی شناخت کی علامت سمجھا جاتا ہے، اور "سفید مینار پر نزول" کو علامتی طور پر امریکہ کے ان مسلم اکثریتی علاقوں — جیسے الجزائر اور مراکش — میں داخل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے، جہاں یہ فوجی کارروائی انجام دی گئی۔ یہ علاقے اُس وقت عیسائی نوآبادیاتی قوتوں کے زیرِ تسلط تھے، اور یورپی جنگی محاذوں کے بعد یہ خطے ایک اہم عسکری میدان بن چکے تھے۔ اسی لیے حدیث میں مسجد کو دمشق میں دکھایا گیا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے حضرت محمد ﷺ کے دور میں دمشق بازنطینی عیسائی سلطنت کے زیرِ حکومت ایک اہم عسکری مرکز تھا۔

دمشق کا مشرقی حصہ تاریخی طور پر صحرا کی جانب کھلتا تھا، جہاں سے بازنطینی دور میں اکثر عرب قبائل یا ایرانی افواج حملہ آور ہوا کرتی تھیں۔ بعینہٖ، دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے بھی بحیرہ روم کے راستے شمالی افریقہ میں داخل ہو کر اپنی پہلی بڑی زمینی فوجی کارروائی اسی جانب سے کی — اُسی سمت سے جہاں سے تاریخ میں بارہا بیرونی حملہ آور گزر چکے تھے۔

نبی عیسیٰؑ کا امامت سے انکار— مسلمانوں کو آزادی کے لیے خود قیادت کی ترغیب دینا (جنوری 1943ء)

نبی عیسیٰ (علیہ السلام) کا مسلمانوں کی امامت سے انکار احادیث میں بیان ہوا ہے، جہاں وہ مسلمانوں کو نماز کی امامت کی دعوت پر فرمائیں گے: "امام تم میں سے ہوگا"[151] اور "تم میں سے بعض دوسروں پر حاکم ہیں۔"[152]

یہ بیان مسلمانوں کے رہنماؤں کی آزادی کی کوششوں کے تناظر میں علامتی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ تشریح الجیریا، مراکش، اور تیونس، جہاں امریکہ کا پہلا بڑا زمینی آپریشن، آپریشن ٹارچ کیا گیا، کے مسلم رہنماؤں کی امریکی مداخلت سے یورپی استعمار سے آزادی کی درخواست کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر، جنوری 1943 میں منعقد ہونے والی کاسابلانکا کانفرنس کے دوران، امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ اور مراکش کے سلطان محمد پنجم کے درمیان ملاقات مراکش کی آزادی کے لیے امید کی علامت بنی۔ سلطان محمد پنجم نے مراکش کی خودمختاری کے خواب کا اظہار کیا اور اس مقصد کے لیے امریکی حمایت کی درخواست کی۔ صدر روزویلٹ نے مراکش کی آزادی کے لیے مستقبل میں حمایت کا عندیہ

دیا، لیکن فوری مداخلت کا وعدہ نہیں کیا کیونکہ امریکہ اُس وقت اپنے جنگی اتحادیوں، بشمول فرانس کے ساتھ تعلقات پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ مراکشی قوم پرستوں نے اس ملاقات کو ایک امید افزا قدم کے طور پر دیکھا اور امریکہ کو اپنی آزادی کی جدوجہد میں ممکنہ حلیف کے طور پر تصور کیا۔[153]

یہ امریکی موقف 1941 کے اٹلانٹک چارٹر[154] میں درج استعمار مخالف اصولوں سے ہم آہنگ تھا، جہاں اقوام کی آزادی اور خودمختاری کے حق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس واقعے میں نبی عیسیٰ (علیہ السلام) کے امامت سے انکار کی تشبیہ مسلمانوں کے رہنماؤں کو ان کی اپنی آزادی کی قیادت کرنے کی ترغیب دینے کے طور پر ظاہر ہوتی ہے، جبکہ امریکی کردار معاون اور بالواسطہ رہا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی خوشبو اور کفار کی موت—دوسری جنگ عظیم میں اخلاقی بیانیہ اور مخالفین کی شکست

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جو بھی کافر نبی عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی خوشبو پائے گا، زندہ نہ رہ سکے گا بلکہ ہلاک ہو جائے گا، اور نبی عیسیٰ علیہ السلام کا سانس وہاں تک پہنچے گا جہاں تک ان کی نگاہ جا سکتی ہو۔[155]

یہ بیان صحیح مسلم کی جس حدیث[156] میں آیا ہے، اُس میں دجال کے ظہور اور انجام کو یاجوج و ماجوج کے واقعات سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ سوویت یونین (دجال) کا ظہور نازی جرمنی (یاجوج و ماجوج) سے پہلے ہوا، اس لیے حدیث میں اس کا تذکرہ اور خاتمہ بھی پہلے آیا۔ یہ ترتیب متوازی بیانیے کی اُس روایتی ساخت کی عکاس ہے جس میں ایک موضوع کو مکمل بیان کر کے دوسرے متوازی موضوع کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے—خواہ دونوں واقعات تاریخی طور پر ایک ہی دور میں واقع ہوئے ہوں۔ دجال سے متعلق دوسری جنگِ عظیم کے اہم واقعات کو اختصار کے ساتھ "حضرت عیسیٰؑ کے سانس کی خوشبو اور کفار کی ہلاکت" جیسے علامتی بیان میں سمیٹ دیا گیا، اور حدیث کا بیانیہ دجال کی ہلاکت پر مکمل ہوا۔ اس کے بعد حدیث میں یاجوج و ماجوج کے واقعات کو الگ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا، جو اسی دور کے متوازی مگر جداگانہ تاریخی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس سیاق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "سانس کی خوشبو" علامتی طور پر اُس اخلاقی بیانیے کی نمائندگی کرتی ہے جو نسل پرستی، جارحیت اور فسطائیت کے خلاف تھا، اور جسے امریکہ نے دوسری جنگ عظیم میں اختیار کیا۔ یہاں "کافر" سے مراد وہ مخالف محور طاقتیں ہیں—یعنی جرمنی، اٹلی اور جاپان—جو اس بیانیے کی منکر تھیں۔ ان کا ہلاک ہونا نہ صرف جنگ میں ان کی فیصلہ کن شکست کا علامتی اظہار ہے، بلکہ اس "سانس" کے دور رس اثرات کی بھی نمائندگی کرتا ہے، جو اُس اخلاقی بیانیے کی کامیابی کا ثبوت ہے، جس نے جنگ کے بعد اقوامِ متحدہ، انسانی حقوق اور عالمی امن جیسے نظریات کی صورت میں ایک نئے عالمی اتفاقِ رائے کی بنیاد رکھی۔

دجال کی تلاش — سوویت چالوں کی کھوج لگانا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حدیث میں دجال کو ڈھونڈنا[157] اس بات کی علامت ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے سرگرمی سے کمیونسٹ سرگرمیوں کی نشاندہی کرنے، ان کے اثرورسوخ اور کمزوریوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور بعض اوقات ان کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے فوجی اور خفیہ طاقت کا استعمال کیا۔ اس میں کوریا (1950-1953) اور ویتنام (1955-1975) میں فوجی مداخلت کے علاوہ 1980 کی دہائی میں افغانستان میں مجاہدین کی سوویت مخالف جدوجہد کی حمایت بھی شامل تھی۔

دجال کا پگھل جانا اور نیزے پر خون — سوویت یونین کی اقتصادی ناکامیاں اور افغانستان میں ہزیمت

حدیث[158] میں دجال کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھنے کے بعد پگھل جانے کا ذکر ہے۔

یہ اس بات کی علامت ہے کہ سوویت یونین سرد جنگ کے آغاز سے ہی داخلی طور پر پگھلنا شروع ہو گیا تھا، کیونکہ اقتصادی ناکامیاں، سیاسی جبر، اور نظریاتی مایوسی نے اس کے مضبوط ڈھانچے کو بتدریج کمزور کر دیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نیزے پر خون کی تعبیر کو افغانستان میں امریکی حمایت یافتہ مجاہدین کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں امریکہ کی بالواسطہ مدد نے سوویت یونین پر ایک کاری ضرب لگائی، جس کے نتیجے میں سوویت یونین معاشی اور دفاعی لحاظ سے شدید زخمی ہو گیا۔

دجال کا باب لد پر قتل — دیوار برلن کا گرنا اور کمیونسٹ پارٹی کی اجارہ داری ختم

حدیث[159] کے مطابق، حضرت عیسیٰ علیہ السلام باب لُد پر دجال کو قتل کریں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کے پاس آئیں گے جو دجال کے فتنے سے محفوظ رکھی گئی ہوگی، اور وہ ان پر شفقت فرماتے ہوئے ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے درجات کے بارے میں ان سے بات کریں گے۔

نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں لُد بازنطینی سلطنت کے تحت ایک اہم انتظامی و تجارتی مرکز تھا، جو یروشلم کے دفاع میں کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ بازنطینی-ساسانی جنگ (602-628 عیسوی) کے دوران ساسانیوں نے پہلے لُد پر قبضہ کیا اور پھر یروشلم کی طرف پیش قدمی کی، جس سے اس کی اسٹریٹیجک اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہی اسٹریٹیجک حیثیت دیوارِ برلن کو حاصل تھی، جو سرد جنگ میں سوویت دفاعی حکمتِ عملی کا ایک مرکزی ستون تھی۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مغربی برلن کو سرمایہ دارانہ کامیابی کی علامت بنا دیا، جس کے نتیجے میں ایسا معاشی فرق پیدا ہوا جو سوویت یونین کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ بالآخر 1989 میں دیوارِ برلن کے انہدام نے سوویت کمزوریوں کو بے نقاب کیا اور مشرقی یورپ

میں کمیونزم کے زوال کا آغاز ہوا۔ افغان جنگ نے سوویت یونین کو اندرونی طور پر شدید کمزور کر دیا، اور دیوارِ برلن کا انہدام وہ فیصلہ کن لمحہ ثابت ہوا جب یہ زخم جان لیوا ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں 1990 میں کمیونسٹ پارٹی کی وہ اجارہ داری ختم ہو گئی، جو 1917ء میں لینن کی روس واپسی کے بعد ایک انقلابی قوت کے طور پر ابھری تھی اور 1922 میں سوویت یونین کے قیام کے بعد مسلسل بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کرتی رہی۔ بالآخر، یہ زوال 1991 میں سوویت یونین کے مکمل انہدام پر منتج ہوا۔

مغربی جرمنی، اور بالخصوص مغربی برلن، نے دجال —یعنی سوویت یونین— کے فتنے سے محفوظ رہتے ہوئے، کئی دہائیوں تک صبر و استقامت کے ساتھ سخت اور غیر یقینی حالات کا سامنا کیا۔ جب دیوارِ برلن گری تو دنیا کی کئی بڑی طاقتوں کو، دوسری جنگِ عظیم کی یادوں کے تناظر میں، ایک متحد جرمنی کے حوالے سے تحفظات لاحق تھے۔ تاہم، امریکہ نے ان خدشات کے باوجود متحدہ جرمنی کی عملی حمایت کی —جو دراصل مغربی جرمنی کی اصلاح اور سوویت نظام کے مقابلے میں ان کی استقامت کا اعتراف تھا۔ یہی وہ صفات ہیں جن کا ذکر احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُن لوگوں پر شفقت کرنے اور جنت میں ان کے اعلیٰ درجات کے بتانے کی صورت میں آیا ہے۔

دجال کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے کعبہ کا طواف کرنا- سرد جنگ میں عالمی برتری کی کوشش

حضرت محمد ﷺ نے خواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، جبکہ دجال ان کے پیچھے چل رہا تھا۔[160]

اس خواب میں علامتی طور پر امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔ یہاں کعبہ عالمی طاقت کے مرکز کی نمائندگی کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے اسلامی روایت میں یہ خدا کے گھر کے طور پر مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح مسلمان خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کعبہ کا طواف کرتے ہیں، اسی طرح اس خواب میں طاقت کے اس علامتی مرکز کا طواف عالمی غلبے کی جستجو کو ظاہر کرتا ہے۔

اس حدیث کی علامتی تعبیر سرد جنگ کے دوران امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان عالمی طاقت کے مقابلے کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امریکہ کی نمائندگی کرتے ہیں، جو عالمی قیادت سنبھالے ہوئے تھا، جبکہ دجال سوویت یونین کی علامت ہے، جو ہمیشہ امریکہ کے پیچھے رہ کر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ کعبہ کا طواف امریکہ اور سوویت یونین کے عالمی اثر و رسوخ کی علامت ہے، جہاں امریکہ نے اپنی برتری قائم رکھی۔ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال کا طواف کے دوران براہِ راست ایک دوسرے سے نہ لڑنا اس حقیقت کی علامت ہے کہ سرد جنگ کے دوران امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جتنی بھی جھڑپیں یا معرکے ہوئے، وہ سب بالواسطہ تھے، براہِ راست جنگ کبھی نہ

ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دو آدمیوں کے کندھوں پر سہارا لے کر طواف کرنا سرد جنگ کے دوران امریکہ کے اہم اتحادیوں، یعنی برطانیہ اور مغربی جرمنی، کی حکمت عملی کے تحت صف بندی اور فیصلہ کن سیاسی حمایت کی علامت ہے۔

احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یاجوج وماجوج اور بعد کے واقعات

اس مضمون میں یاجوج وماجوج کے لیے ایک الگ باب مختص کیا گیا ہے، لہٰذا اس حصے میں صرف وہی تفصیلات شامل کی گئی ہیں جن کا ذکر پچھلے باب میں نہیں ہوا۔ جیسا کہ اس مضمون میں پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، چونکہ سوویت یونین کا ظہور نازی جرمنی سے قبل ہوا تھا، اس لیے حدیث میں اس کا تذکرہ اور انجام پہلے بیان کیا گیا، جبکہ یاجوج وماجوج کے واقعات کو بعد میں تفصیل سے پیش کیا گیا—یہ اس طرزِ بیان کے مطابق ہے جو متوازی بیانیوں میں عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ مزید وضاحت اور تعبیر سے متعلق نکات کے لیے "یاجوج وماجوج" کے باب میں موجود "تعبیر سے متعلق سوالات" ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں احادیث کے واقعات کو زمانی ترتیب کے مطابق بیان کیا جا رہا ہے۔

یاجوج وماجوج کا کوہِ طور کو گھیرنا—دوسری جنگ عظیم میں اتحادی تعاون کے ذریعے مزاحمت

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کوہِ طور پر یاجوج وماجوج کے محاصرے میں آ جائیں گے، جن کا مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہ ہوگی۔ اس وقت حالات اتنے سنگین ہوں گے کہ بیل کے سر کی قیمت سو دینار سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس کٹھن گھڑی میں نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے نجات کی دعا کریں گے۔[161]

محاصرہ: یاجوج وماجوج کا کوہِ طور کے گرد گھیراؤ جرمنی کی دوسری جنگ عظیم کے دوران جارحانہ توسیع پسندی اور اتحادی افواج کے گھیراؤ کی علامت ہے۔ جس طرح یاجوج وماجوج کے سامنے کسی میں مقابلے کی طاقت نہ ہوگی، اسی طرح ابتدا میں فاشزم کا سیلاب بھی ناقابلِ مزاحمت محسوس ہوتا تھا۔

کوہِ طور: کوہِ طور تاریخی طور پر عہد کے مقام کی علامت ہے، جیسا کہ نبی موسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل سے کوہِ طور پر عہد لیا۔[162] یہ عالمی معاہدوں اور حکمت عملیوں کی نمائندگی کرتا ہے، جن کے تحت اتحادی افواج نے دوسری جنگ عظیم میں ظالم طاقتوں کے خلاف جدوجہد کی۔ متعدّد معاہدوں اور حکمت عملیوں پر اتفاق کیا گیا، جیسے کہ:

کاسابلانکا کانفرنس (جنوری 1943)

کیوبیک معاہدہ (اگست 1943)

تہران کانفرنس (نومبر-دسمبر 1943)

بریٹن ووڈز کانفرنس (جولائی 1944)

یالٹا کانفرنس (فروری 1945)

بیل کے سر کی قیمت: حدیثِ نبویؐ [163] میں بیان "بیل کے سر کی قیمت سو دینار سے زیادہ ہو جانا" دوسری جنگ عظیم میں افراطِ زر، معاشی زبوں حالی اور خوراک کی شدید قلت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح کی منظرکشی بائبل کی کتابِ مکاشفہ میں بھی ملتی ہے، جہاں اجناس کی قیمتیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ ایک عام فرد کے لیے بنیادی خوراک کا حصول بھی دشوار ہو جاتا ہے۔[164] مثال کے طور پر، دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ میں بلٹز کے دوران، جب جنگی وسائل کو اولیت دی گئی، عوام کو خوراک اور روزمرہ کی ضروری اشیاء کی شدید کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ حالات تھے جب وسائل کی غیر مساوی تقسیم اور مہنگائی نے عام زندگی کو تقریباً مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

اللہ سے دعا: "اللہ سے دعا" امریکی قیادت کی جانب سے خدا سے کامیابی کی التجا کا اظہار ہے۔ مثال کے طور پر، ڈی-ڈے کی شام (جون 1944) صدر روزویلٹ نے قوم سے ریڈیو پر خطاب کیا اور اتحادی افواج کی کامیابی اور حفاظت کے لیے دل سے دعا کی۔ اس دعا کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں [165]:

> "۔۔۔اے قادر مطلق خداوند! آج ہمارے بیٹے، جو ہماری قوم کا فخر ہیں، ایک عظیم جدوجہد پر نکلے ہیں۔ یہ جدوجہد ہماری ریاست، ہمارے دین اور ہماری تہذیب کی حفاظت کے لیے ہے، اور ایک مصیبت زدہ انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے ہے۔۔۔ انہیں سیدھے اور سچے راستے پر رکھ؛ ان کے بازوؤں کو قوت دے، ان کے دلوں کو مضبوط کر، اور ان کے ایمان میں پختگی عطا فرما۔۔۔ انہیں رات دن، بغیر کسی آرام کے، سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا ہے، یہاں تک کہ فتح حاصل ہو جائے۔۔۔ جنگ کی شدت سے انسانوں کی روحیں لرز جائیں گی۔۔۔ تیری برکت سے ہم اپنے دشمنوں کی ناپاک قوتوں پر غالب آئیں گے۔ ہمیں لالچ اور نسلی غرور کے پیروکاروں پر فتح عطا فرما۔۔۔ بے شک تیری مرضی پوری ہوگی، اے قادر مطلق خداوند۔ آمین۔"

یاجوج اور ماجوج کے بعد زمین کی صفائی—جنگ کی باقیات کا خاتمہ

حدیث [166] میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے اور زمین میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہ پائیں گے جو یاجوج و ماجوج کی لاشوں کی گندگی اور بدبو سے بھری نہ ہو۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ سے دعا کریں گے، تو اللہ پرندے بھیجے گا جن کی گردنیں دو کوہان والے اونٹ کی گردنوں کی طرح ہوں گی، اور وہ ان لاشوں کو اٹھا کر اللہ کی مرضی کے مطابق کہیں پھینک دیں گے۔ پھر اللہ ایسی بارش نازل کرے گا جسے نہ مٹی کے گھر روک سکیں گے اور نہ ہی اونٹ کے بالوں کے خیمے، اور وہ زمین کو دھو ڈالے گی یہاں تک کہ وہ آئینے کی طرح صاف ہو جائے گی۔

بدبو: یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا زمین پر اُترنے پر ایک بالشت بھر جگہ بھی لاشوں سے خالی نہ پانا، دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں یورپ میں ہونے والی وسیع پیمانے پر تباہی اور بربادی کی علامت ہے۔ پورے شہر ملبے کا ڈھیر بن گئے، کروڑوں افراد لقمۂ اجل بنے، اور پورا براعظم تباہی، لاشوں اور مصیبت زدہ آبادیوں سے بھر گیا۔

اللہ سے دعا: اللہ سے دعا جنگ عظیم دوم کے بعد امن، بھائی چارے، اور دنیا کی از سرِ نو تعمیر کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرنا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے صدر نے جنگ جیت کر کہا[167]:

> "۔۔۔اب، لہٰذا، میں، --- 19 اگست 1945، کو یومِ دعا کے طور پر مقرر کرتا ہوں۔ میں ریاست ہائے متحدہ کے تمام مذاہب کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ متحد ہو کر خدا کا شکر ادا کریں اس فتح کے لیے جو ہمیں حاصل ہوئی، اور دعا کریں کہ وہ ہمیں امن کے راستوں کی طرف راہنمائی اور حمایت عطا فرمائے۔۔۔"۔

اونٹ کی گردن والے پرندے: دو کوہانوں والے اونٹ عربوں کے نزدیک اپنی شاندار وجاہت اور غیر معمولی برداشت کے لیے مشہور تھے، جو اپنی مضبوط گردنوں اور گھنے بالوں کی بنا پر نمایاں ہوتے تھے۔ حدیث میں مذکور پرندے، جن کی گردنیں دو کوہانوں والے اونٹ کی مانند تھیں اور جو لاشوں کو اٹھا کر لے گئے، جنگ کے بعد کی اجتماعی اور وسیع پیمانے پر کی گئی کوششوں کی علامت ہیں۔ یہ اس تاریخی مرحلے کی نشاندہی کرتے ہیں جب جنگ کے ملبے کو صاف کیا گیا، انسانی ہمدردی کی کوششیں کی گئیں، اور جنگی جرائم کے ٹرائلز کے ذریعے ظلم و بربریت کے خلاف بین الاقوامی قانون کے تحت مثال قائم کی گئی۔ نازی نظریات کے خاتمے اور جنگ کے مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کا عمل بھی اسی بڑے پیمانے پر کی گئی "صفائی" کا حصہ تھا۔

بارش: اس کے بعد ہونے والی بارش ان عالمی تبدیلیوں کی علامت ہے جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں اور نظریات کو دھو کر ایک نئے عالمی نظام کی بنیاد رکھی — جہاں نازیت، فسطائیت، اور استعماری تسلط کو منظم انداز میں ختم کیا گیا۔ امریکہ کے مارشل پلان کے ذریعے تباہ حال یورپ کو معاشی اور صنعتی امداد فراہم کی گئی، جبکہ اقوام متحدہ، آئی ایم ایف، اور عالمی بینک جیسے ادارے تشکیل دیے گئے تاکہ سیاسی اور معاشی مسائل کا پرامن حل نکالا جا سکے، اور عالمی استحکام کو یقینی بنایا جا سکے۔ اونٹ کے بالوں کے خیموں کا حوالہ — جو عربوں میں اپنی پائیداری، خاص طور پر بارش برداشت کرنے کی صلاحیت کے لیے مشہور تھے — اور مٹی کے گھروں کا ذکر، جو ان کی مستقل بستیوں میں عام تھے، ان کا بہہ جانا، اس غیر معمولی تبدیلی کی شدت کو اجاگر کرتا ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد واقع ہوئی اور جس نے دنیا کا نقشہ بدل دیا: یہ تبدیلی اس زمین کی طرح ہے جو گویا آئینے کی طرح صاف کر دی گئی ہو۔

مال و دولت کی فراوانی—جنگ کے بعد کا دور (1945ء–1973ء)

حدیث[168][169] میں ذکر ہے کہ زمین اس قدر برکت والی ہو جائے گی کہ پھل، مویشی، اور دیگر وسائل بڑی جماعتوں، قبیلوں، اور خاندانوں کے لیے کافی ہوں گے۔

یہ منظرنامہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور سے مشابہت رکھتا ہے، جسے گولڈن ایج آف کیپیٹلزم (1945–1973)[170] کہا جاتا ہے۔ اس دور میں دنیا بھر میں بے مثال اقتصادی ترقی ہوئی، جس میں صنعتی ترقی، تکنیکی جدت، عالمی تجارت میں اضافہ، اور زندگی کے معیار میں بہتری شامل تھی۔ مغربی دنیا اور ایشیا کے کئی ممالک نے خوشحالی کے اس دور سے بے پناہ فوائد حاصل کیے۔

اس کے برعکس، وہ علاقے جو کمیونسٹ پالیسیوں پر عمل پیرا تھے، خوشحالی میں تاخیر کا شکار رہے اور بعد میں آزاد معاشی حکمت عملیوں کو اپنانے کے بعد ترقی کر سکے۔ اس مادی فراوانی کے دور کو ایک برکت والے زمانے کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو دولت اور مواقع سے بھرپور تھا۔

ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا—جنگ کے بعد کی آزادی پسندی کے دور میں عبادت کی اہمیت (خصوصاً 1960ء کی دہائی میں)

حدیث[171] میں کہا گیا ہے کہ ایک سجدہ دنیا کی تمام مال و دولت سے زیادہ قیمتی ہو گا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد تیزی سے آنے والی آزادی پسندی کی طرف اشارہ ہے، جس کی نمایاں علامات میں روایتی اخلاقی اقدار کا زوال، فردیت کا فروغ، اور قائم شدہ اقتدار و روایات کا وسیع پیمانے پر انکار شامل ہے۔ جنگ کے بعد کا دور، اگرچہ مادی خوشحالی کا تھا، لیکن صارفیت اور مادیت کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے ساتھ اخلاقی بحران بھی پیدا ہوا۔ اس لئے یہ حدیث دنیاوی آسائشوں اور دولت کی کثرت کے ہوتے ہوئے خدا کی عبادت کی اہمیت کے بڑھ جانے کو ظاہر کرتی ہے۔

احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بقیہ واقعات

ذیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد پیش آنے والے باقی تمام واقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

سور کو قتل کرنا—جاپان کی سامراجیت کا خاتمہ

حدیث[172] میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سور کو قتل کریں گے۔

جیسا کہ زمین کے جانور کی نشانی کو بیان کرتے ہوئے بتایا گیا کہ جانور مستقبل کی پیشگوئیوں میں سلطنتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور اس سیاق و سباق میں سور جاپان کے سامراجی رویے اور حکمت عملی کی علامت ہے۔ "سور کو قتل کرنے" کی علامت جاپان کی شاہی سلطنت کی شکست کے مترادف ہے، جس میں امریکہ نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ جاپان کی

سامراجیت کو سور کی شکل میں پیش کرنے کی تین بنیادی وجوہات ہیں:

جاپان کا دوغلا پن: جاپان نے "ایشیا ایشیائیوں کے لیے" کے نعرے کے ساتھ ایشیا کو آزاد کرنے کا دعویٰ کیا، لیکن اس کی اپنی سامراجی پالیسیاں انتہائی استحصالی تھیں۔ یہ تضاد سور کی عکاسی کرتا ہے، جو بظاہر بھیڑ بکری کی نسل سے دکھتا ہے لیکن گوشت بھی کھاتا ہے۔

لالچ اور وسائل کی بھوک: جاپان کی سامراجی توسیع کے پیچھے اس کی صنعتی اور فوجی ضروریات کے لیے وسائل کی شدید ضرورت تھی۔ فتح کیے گئے علاقوں سے خام مال اور انسانی وسائل کا استحصال اس کی حکمت عملی کا حصہ تھا، جو سور کی شدید بھوک کی علامت ہے۔

بحری اور زمینی توسیع: جاپان نے بحرالکاہل اور بحرِ ہند میں متعدّد جزائر اور خطوں پر قبضہ کیا۔ یہ دلدلی، گرم اور نم علاقوں میں جنگوں کی نمائندگی کرتا ہے، جو سور کے قدرتی مسکن سے مشابہ ہیں۔

"سور کو قتل کرنا" اس عمل کی علامت ہے جب امریکہ نے جاپان کی سامراجی امنگوں کو ختم کر دیا، اس کی فتوحات روکی، اور اسے ایک جدید، غیر توسیع پسند قوم میں تبدیل کیا۔

جزیہ ختم کرنا—قومی ریاستوں میں مساوات کا اصول

حدیث [173] میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جزیہ کو ختم کریں گے۔ جزیہ کے خاتمے کی علامت ایک ایسے نظام کے قیام کی ہے جہاں تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، امریکہ نے ایک نیا عالمی نظام قائم کیا جو مساوات اور خود ارادیت کے اصولوں پر قومی ریاستوں کے قیام پر مبنی تھا۔ یہ فلسفہ اقوام متحدہ کے منشور جیسے فریم ورک کے ذریعے باضابطہ طور پر اپنایا گیا، جس نے مساوات اور خود مختاری پر زور دیا۔ مسلم اکثریتی ممالک میں بھی اس فلسفے نے جزیہ کے خاتمے میں بالواسطہ طور پر کردار ادا کیا، کیونکہ مسلم حکومتیں بھی مذہب سے بالاتر ہو کر مساوات کو فروغ دینے کی طرف مائل ہوئیں۔

صلیب توڑنا—عیسائی دنیا میں سیکولرزم کا فروغ

حدیث [174] میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب کو توڑیں گے۔ "صلیب توڑنے" کی علامت ان سیکولر تبدیلیوں کی ہے جو امریکہ نے عیسائی اکثریتی ممالک میں چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو فروغ دینے کے لیے کیں۔ امریکہ کی سفارتی کوششوں اور سرمایہ کاری نے ان ممالک میں چرچ کے سیاسی اثر و رسوخ کو کم کیا اور سیکولر حکومتوں کے قیام کو ممکن بنایا۔ یہ تبدیلی ان ممالک میں حکمرانی کے نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کرنے کا باعث بنی۔ آج، عیسائی اکثریتی ممالک، خاص طور پر مغربی دنیا، سیکولر حکومتوں کے تحت کام کرتے ہیں، جہاں چرچ ریاستی معاملات میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتا۔ یہ صلیب کے علامتی خاتمے کے مترادف ہے۔

عادل حکمران کے طور پر نزول-جنگ کے بعد عالمی اداروں کا قیام

حدیث[175] میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عادل حکمران کے طور پر نازل ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عادل حکمران کے طور پر پیش کرنے کی علامتی تشریح دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی اداروں کی تشکیل میں امریکہ کے کردار سے مماثلت رکھتی ہے۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے قیام میں مرکزی کردار ادا کیا، جس کا مقصد بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا، تنازعات کو حل کرنا، اور مستقبل کی جنگوں کو روکنا تھا۔ بعد میں اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کی تشکیل دی گئی، جس کا مقصد نوآبادیاتی تسلط کے خاتمے کو یقینی بنانا اور نوآزاد ممالک کو خود مختاری اور استحکام کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ اقوام متحدہ کی تنظیم عالمی امن اور انصاف قائم کرنے کے لیے ایک جامع فریم ورک کے طور پر ابھری، جو عادل حکمرانی کے تصور کی عکاسی کرتا ہے۔

جنگ کے بعد امریکی قیادت نے مارشل پلان جیسے اقدامات متعارف کرائے، جن کا مقصد جنگ سے متاثرہ یورپ کی تعمیر نو کرنا تھا۔ اسی طرح، جنرل ایگریمنٹ آن ٹیرفس اینڈ ٹریڈ جیسے ادارے قائم کیے گئے، جو بعد میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں تبدیل ہو گئے، تاکہ عالمی تجارت کو منصفانہ اور کھلا بنایا جا سکے۔ اور بریٹن ووڈز نظام (آئی ایم ایف اور عالمی بینک) عالمی معیشت کو مستحکم رکھنے کے لیے تشکیل دیا گیا، تاکہ معاشی بحران کے باعث ممالک دوبارہ جنگ میں نہ الجھیں۔ یہ اقدامات زمین پر امن، انصاف، اور معاشی استحکام کے قیام کی احادیث میں بیان کردہ عادل حکمران کے کردار سے ہم آہنگ ہیں۔

احادیث میں دجال کے بعد کے واقعات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر کا ذکر صحیح بخاری اور مسلم میں نہیں ہے۔ البتہ، دجال کی موت کے بعد حدیث میں ذکر کردہ سات سالہ[176] پرامن دور 1991 سے 1998 تک کے عرصے کی عکاسی کرتا ہے۔ ان سات سالوں میں، دنیا نے نسبتاً عالمی استحکام دیکھا، اور امریکہ واحد سپر پاور کے طور پر ابھرا۔

شام اور یمن کی ٹھنڈی ہوائیں — مغرب اور مشرق بعید کی آسائشیں (1998ء کے بعد)

حدیث کے مطابق، دجال کی ہلاکت کے سات برس بعد اللہ تعالیٰ شام[177] اور یمن[178] کی سمت سے ایک نہایت نرم و لطیف ٹھنڈی ہوا بھیجے گا، جو بغلوں کے نیچے سے انہیں پکڑے گی[179]۔ یہ خوشگوار ہوا ہر اس انسان کو موت دے گی جس کے دل میں رتی برابر ایمان یا بھلائی باقی ہو گی، اور زمین پر صرف بدکار لوگ بچیں گے۔ یہ لوگ گدھوں کی طرح زنا کریں گے، پرندوں کی مانند ہلکے پھلکے ہوں گے، درندوں جیسے خواب دیکھیں گے، بتوں کی عبادت کریں گے، اور اچھائی و برائی کی تمیز سے عاری ہو جائیں گے — حالانکہ ان کے پاس آسائشوں اور رزق کی فراوانی ہو گی۔ اسی حال میں قیامت واقع ہو گی۔

دجال کی موت — یعنی سوویت یونین کا خاتمہ — دسمبر 1991 میں وقوع پذیر ہوا، جس کے بعد کا سات سالہ دور 1990 کی دہائی کے آخر سے جڑتا ہے۔ اس حدیث کی تشریح درج ذیل میں بیان کی گئی ہے:

"شام کی ٹھنڈی ہوا" مغربی عیسائی دنیا کے اثر و رسوخ کی علامت ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں شام بازنطینی عیسائی سلطنت کے زیر تسلط تھا۔ جس طرح ٹھنڈی ہوائیں عرب کے تپتے صحرا میں راحت و سکون کی علامت سمجھی جاتی تھیں، اسی طرح جدید دور میں مغربی دنیا کی صارفیت، مادر پدر آزادی، اور مادی ترقی نے، گلوبلائزیشن اور انٹرنیٹ کے ذریعے، دنیا کے ہر خطے میں اپنے اثرات پہنچائے اور دلوں کو ایک مخصوص قسم کے فریبِ سکون میں مبتلا کر دیا۔

"یمن سے ریشم سے زیادہ نرم ہوا" مشرقی ایشیائی ممالک، خصوصاً چین اور دیگر صنعتی اقوام، کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جیسے عہدِ رسالت میں یمن کو ایک بڑا تجارتی مرکز اور عیش و عشرت کی اشیاء کا منبع سمجھا جاتا تھا، اسی طرح آج کے مشرقی ایشیائی ممالک دنیا کے لیے مادی فراوانی اور صارفیت کی فراہمی کے بڑے مراکز بن چکے ہیں۔ ان کا عالمی تجارتی راستوں پر غلبہ، خصوصاً جنوبی بحیرہ چین پر کنٹرول، قدیم عدن اور یمنی تجارتی عظمت کی جدید مثال پیش کرتا ہے۔

"ہوا کا زیرِ بغل مومنوں کو پکڑنا اور روح نکالنا" — زیرِ بغل جسم کا ایک نہایت حساس حصہ ہے، اور مومنوں کی روح کو اسی مقام سے نکالے جانے کا مطلب ہے کہ انسان کی باطنی خوبیوں اور لطافتوں کا زوال اُس کی مسلسل حسی تھکن (sensory overload) کی وجہ سے ہو رہا ہے — جس میں آنکھوں، ذہن، اور بدن کو جدید ٹیکنالوجی، تفریحات، موسیقی اور لذیذ کھانوں کی مسلسل محرکات نے گھیر لیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل تحریک اور لذت کی فراوانی نے انسان کی حِسی قوتوں کو مضمحل کر دیا ہے۔

"گدھوں کی طرح زنا" شرم و حیا کے زوال کی علامت ہے۔

"پرندوں کی پھرتی" انسانوں کی بے فکری، جلد بازی اور عمل کی سطحیت کو ظاہر کرتی ہے، جبکہ "درندوں جیسے خواب" ان کی خواہشات میں درندگی اور اخلاقیات سے بیگانگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

"بتوں کی پوجا" الحاد (Atheism)، دہریت (Materialism) اور عملی دیئت (Functional Deism) کو ظاہر کرتی ہے، جو جدید دنیا میں بہت بڑے پیمانے پر مختلف صورتوں میں شرک اور بت پرستی کی تجدید کی مثالیں ہیں، جہاں انسان بت پرستی کی ہی طرح اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں — جیسے نفس، مادہ، یا انسانی خواہشات — کو اپنی زندگی کا محور اور مرکزِ امید بناتا ہے۔

یوں احادیث ایک ایسی دنیا کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں جہاں قیامت سے پہلے عیش و عشرت، مادی ترقی کی بت پرستی، اور خدا سے بیگانگی غالب ہوں گی۔ ایک ایسی دنیا جس میں اہلِ ایمان کا خاتمہ اور بدکاروں کا غلبہ ہو گا۔

تعبیر سے متعلق سوالات

دوسری جنگِ عظیم اور سرد جنگ میں سوویت یونین کا کردار

دوسری جنگِ عظیم کے دوران، سوویت یونین اتحادی افواج کے ساتھ تھا اور نازی جرمنی کی مخالفت کر رہا تھا (جسے احادیث میں یاجوج وماجوج سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ تاہم، جنگ کے بعد سرد جنگ کے دوران، سوویت یونین ایک کمیونسٹ طاقت کے طور پر مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیے رہا، کمیونزم اور الحاد کو فروغ دیا، اور عالمی اثر و رسوخ میں امریکہ کا حریف بنا۔ اس طرح اس نے دجال جیسے کردار کا مظاہرہ کیا، جس سے اس کے کردار میں ایک بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے۔

احادیث میں بیان کردہ واقعات میں ایک ہی قوت مختلف تاریخی سیاق و سباق میں مختلف علامتی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اسی طرح کی مثال ہمیں آسمانی کتب میں بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً بابل کی سلطنت کو کتاب دانیال میں ایک ظالمانہ اور بت پرست طاقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس نے حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کو تباہ کیا۔[180] لیکن قرآن (سورہ بنی اسرائیل) میں انہی بابلیوں کو "میرے بندے" کہا گیا ہے، جب اللہ نے انہیں بنی اسرائیل پر بطور عذاب مسلط کیا۔[181] قرآن کا یہ بیان بابلیوں کے عقائد کی تائید نہیں کرتا، بلکہ یہ دکھاتا ہے کہ جابر قوتیں بھی مخصوص حالات میں الٰہی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں — جس طرح سوویت یونین، جو دجالی صفات کا حامل تھا، دوسری جنگِ عظیم میں اتحادی افواج کا حصہ تھا۔

یہ مثالیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ علامات کو ان کے تاریخی اور دینی سیاق و سباق میں سمجھنا چاہیے، اور انہیں جامد یا مستقل کرداروں تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری جنگِ عظیم اور سرد جنگ کے دوران اخلاقی مسائل

حدیث میں مستقبل کی پیشگوئیوں کے واقعات میں مختلف ریاستوں کے عمومی کردار کی نشاندہی کی گئی ہے، مگر ان میں بیان کردہ کرداروں کے ہر عمل کی اخلاقی منظوری کی ضمانت نہیں دی گئی۔

مثال کے طور پر، امریکہ کی فسطائیت اور کمیونزم مخالف کوششوں کے باوجود، جاپان پر ایٹم بم گرانا، کوریا میں بے دریغ بمباری، اور ویتنام میں جنگی جرائم تاریخی حقائق ہیں، جن میں عام شہریوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ دینی نقطہ نظر سے، ان اقدامات کو اخلاقی طور پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حدیث ان کی اخلاقی درستگی یا منظوری کا عندیہ نہیں دیتی۔

امریکہ کے اپنے مفادات

کیا امریکہ نے یہ سب کچھ محض اپنے مفادات کے تحت کیا، یا اس نے شعوری طور پر ایک مسیحا کا کردار ادا کیا؟ یہ مضمون یہ تجویز کرتا ہے کہ تاریخ میں پیش آنے والے واقعات صرف انسانی ارادوں کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ وہ خدائی تقدیر کا حصہ

بن کر قیامت کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ دوسری جنگ عظیم اور سرد جنگ میں امریکہ کی مداخلت بظاہر اس کے جغرافیائی اور معاشی مفادات کے تحت تھی، مگر اس کے اقدامات نادانستہ طور پر ایک بڑے، پیش گوئی شدہ عالمی بیانیے کی تکمیل کا ذریعہ بنتے چلے گئے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں مسیح کے آنے کے تصورات

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق جو احادیث بیان ہوئی ہیں، وہ یہودی اور عیسائی تصورات سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہیں اور ایک بالکل منفرد حقیقت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ذیل میں پہلے یہودیوں اور پھر عیسائیوں کی پیشگوئیوں سے متعلق چند بنیادی نکات پیش کیے جا رہے ہیں:

یہودی پیشگوئیاں: بنی اسرائیل کے انبیاء نے پیشگوئی کی تھی کہ پہلے معبد (ہیکل) کی تباہی کے بعد یہود دوبارہ یروشلم لوٹیں گے، معبد کی دوبارہ تعمیر ہوگی، شمالی اقوام اس معبد کی بے حرمتی کریں گی، اور آخر کار اللہ تعالیٰ یہود کو ان اقوام پر فتح عطا فرمائے گا۔ انہی پیشگوئیوں کے تسلسل میں اللہ کی طرف سے ایک "مسیح" —یعنی مسح شدہ اور منتخب نبی— کے ظہور کی بشارت دی گئی۔

تاریخی تکمیل: یہ پیشگوئیاں تاریخ میں پوری ہو چکی ہیں: دوسرا معبد 516 قبل مسیح میں تعمیر ہوا، پھر یونانی دور میں خصوصاً سلوقی یونانیوں نے یروشلم میں مداخلت کی، اور 167 قبل مسیح میں معبد کی بے حرمتی کی۔ اس کے بعد یہود کو ان اقوام پر غیر معمولی فتح حاصل ہوئی، جسے تاریخ میں "مکابی بغاوت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہی حالات کے کچھ عرصے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔

مسیح کے تصور میں بگاڑ: وقت گزرنے کے ساتھ، اکثر یہودیوں نے ان پیشگوئیوں کو تاریخی واقعات سے جوڑنے کے بجائے، مختلف پیشگوئیوں کو ملا کر مسیح کے تصور کو ایک برگزیدہ اللہ کے رسول کی بجائے ایک عالمی فاتح اور بادشاہ کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ مسیح کے اس نئے تصور کی بنیاد در حقیقت ان کے ذاتی مفروضات اور مذہبی تشریحات پر تھی، نہ کہ وحی کی روشنی میں حاصل ہونے والے کسی درست فہم پر۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے بعد یہود دنیا کی امامت سے معزول کر دیے گئے۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی بعثت کے دوران اس کا واضح اعلان فرمایا،[182] اور قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کی تصدیق کی ہے۔[183]

دوسری طرف، عیسائیوں کا ماننا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واپس آئیں گے اور ان کے پیروکار ہزار سال تک دنیا پر حکومت کریں گے۔ یہ تصور، یہود کی مانند، مختلف پیشگوئیوں کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ذیل میں عیسائی پیشگوئیوں سے متعلق چند بنیادی نکات پیش کیے جا رہے ہیں:

مسیح کی واپسی: انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی کا جو ذکر ملتا ہے، وہ درحقیقت یہودیوں کے انکارِ مسیح کے نتیجے میں 66 سے 70 عیسوی کے دوران ان پر نازل ہونے والے عذابِ الٰہی کی پیشگوئی کا ایک علامتی بیان ہے، جس کا انجام 70 عیسوی میں رومیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی اور معبد کی بے حرمتی کی صورت میں ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس عذاب کی وضاحت اس انداز سے فرمائی کہ ان کے انکار کرنے والوں کی موجودہ نسل کے ختم ہونے سے پہلے یہ واقعات پیش آئیں گے۔ اس میں ہیکل کے ایک ایک پتھر کے دوسرے پر باقی نہ رہنے کی پیشگوئی بھی شامل ہے، جو تاریخی حقائق سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔[184]

ایک ہزار سالہ حکومت: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب مکاشفہ میں دنیا پر لوہے کے عصا سے حکومت کرنے کا اختیار ایک ایسی شخصیت کو دیا گیا ہے جسے "صادق" اور "امین" کے القابات سے پکارا گیا ہے۔[185] یہ القابات واضح طور پر رسول اکرم ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے ذریعے وہ طاقتیں زوال پذیر ہوئیں جنہیں کتابِ مکاشفہ میں علامتی طور پر پیش کیا گیا تھا: سمندر کا جانور، جس کی تعبیر رومن سلطنت کے طور پر کی جاتی ہے؛ زمین کا جانور، جو کلیسا کی نمائندگی کرتا ہے؛ اور سرخ جانور، جسے فارسی سلطنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان فتوحات نے ایک عالمی مسلم حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ مسلم خلافت — جو خلافتِ راشدہ سے لے کر خلافتِ عثمانیہ تک پھیلی — تقریباً ایک ہزار سال تک دنیا میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھے رہی، اور یہ بالکل اسی پیشگوئی کی تکمیل تھی جو کتابِ مکاشفہ میں بیان کی گئی تھی۔[186] سترہویں صدی میں یورپی اقوام کا "عہدِ دریافت" اپنے اختتام کو پہنچا اور اس کے بعد یورپی نوآبادیاتی طاقتیں، جنہیں مکاشفہ میں یاجوج و ماجوج کہا گیا ہے،[187] مسلم دنیا سمیت کئی خطوں پر تسلط قائم کرنے کے لیے سرگرم ہو گئیں۔ اس نوآبادیاتی یلغار کے نتیجے میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکمرانی زوال پذیر ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی اور "مردِ فتنہ": حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی کا سب سے واضح ذکر عہدِ جدید میں اُس وقت سامنے آتا ہے جب "مردِ فتنہ" کے ظہور کا بیان کیا جاتا ہے — یہ ایک ایسا کردار ہے جو اسلامی تصورِ دجّال سے بہت قریب تر ہے۔[188] یہ نمایاں مشابہت احادیث کے اُس بیانیے کے مطابق ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کا سامنا کرتے اور اُسے شکست دیتے ہیں۔ اس تصور کو اس مضمون میں علامتی طور پر سوویت یونین کی نمائندگی اور سرد جنگ کے دوران امریکہ کے کلیدی کردار سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی اور مردوں کا زندہ ہونا: عہدِ جدید کی متعدّد آیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی واپسی کو مردوں کے اٹھنے کے ساتھ جوڑتی ہیں، جس دوران انہیں گواہی دینے والے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔[189] یہ تصور قرآن مجید کی سورہ مائدہ میں موجود قیامت کے دن کے اس بیانیے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اپنے ماننے والوں کے سامنے شہادت دیں گے۔[190]

مختصراً یہ کہ یہود و نصاریٰ کے مسیح کی آمد سے متعلق تصورات قرآن، احادیث اور خود ان کی اپنی کتابوں کی تعلیمات سے متضاد ہیں، کیونکہ ان کے یہ تصورات مختلف پیشگوئیوں کے امتزاج، مذہبی قیاس آرائیوں کے ذریعے ان کی تشریح کرنے، اور ان کے تاریخی تناظر کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہیں۔ مزید یہ کہ ان کی کتب میں اس موضوع سے متعلق تمام پیشگوئیاں تاریخ کے صفحات میں پہلے ہی پوری ہو چکی ہیں۔

یہ بات ہمیں سکھاتی ہے کہ مستقبل کی پیشگوئیوں کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے کے بجائے، ماضی کے واقعات کو کھلے دل و دماغ اور گہری بصیرت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور جب کسی پیشگوئی کی تکمیل کی علامات ظاہر ہوں، تو ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے نہ صرف ہمیں اُن نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کا موقع عطا فرمایا، بلکہ ہمیں اپنے نبی ﷺ کی پیشگوئیوں کی روشنی میں اُنھیں پہچاننے کی توفیق بھی دی۔

حوالہ جات

142) Daniel 7:4: https://www.bible.com/bible/111/dan.7.4.NIV
143) Quran 18:99: https://quran.com/18/99
144) نزول مسیح، سید منظور الحسن، نومبر ۲۰۲۳، غامدی انسٹیٹیوٹ آف اسلامک لیئرننگ
145) Quran 4:157: https://quran.com/4 /157
146) Quran 3:55: https://quran.com/3/55
147) Quran: 5:116-117: https://quran.com/5/116-117
148) نزول مسیح، سید منظور الحسن، نومبر ۲۰۲۳، غامدی انسٹیٹیوٹ آف اسلامک لیئرننگ
149) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
150) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
151) Sahih Bukhari 3449: https://sunnah.com/bukhari:3449
152) Sahih Muslim 156: https://sunnah.com/muslim:156
153) آزادی کے منشور کی پیشکش: مراکش کی آزادی کی جدوجہد میں ایک سنگِ میل
https://www.maroc.ma/en/news/presentation-independence-manifesto-milestone-moroccos-struggle-independence
154) https://en.wikipedia.org/wiki/Atlantic_Charter
155) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
156) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
157) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
158) Sahih Muslim 2897: https://sunnah.com/muslim:2897
159) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
160) Sahih Bukhari 5902: https://sunnah.com/bukhari:5902

161) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
162) Quran 7:171: https://quran.com/7/171
163) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
164) Revelation 6:5–6: https://www.bible.com/bible/111/REV.6.5-6.111
165) https://www.nationalww2museum.org/war/articles/franklin-d-roosevelts-d-day-prayer-june-6-1944
166) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
167) https://www.trumanlibrary.gov/library/proclamations/2660/victory-day-prayer
168) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
169) Sahih Bukhari 2476: https://sunnah.com/bukhari:2476
170) https://en.wikipedia.org/wiki/Post%E2%80%93World_War_II_economic_expansion
171) Sahih Bukhari 3448: https://sunnah.com/bukhari:3448
172) Sahih Bukhari 2476: https://sunnah.com/bukhari:2476
173) Sahih Bukhari 2476: https://sunnah.com/bukhari:2476
174) Sahih Bukhari 2476: https://sunnah.com/bukhari:2476
175) Sahih Bukhari 2476: https://sunnah.com/bukhari:2476
176) Sahih Muslim 2940a https://sunnah.com/muslim:2940a
177) Sahih Muslim 2940a: https://sunnah.com/muslim:2940a
178) Sahih Muslim 117: https://sunnah.com/muslim:117
179) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
180) Daniel 7:1–28: https://www.bible.com/bible/111/DAN.7.1-28.NIV
181) Quran 17:5: https://quran.com/17/5
182) Matthew 21:43: https://www.bible.com/bible/111/MAT.21.43
183) Quran 3:55: https://quran.com/3/55
184) Matthew 24: https://www.bible.com/bible/111/MAT.24
185) Revelation 19:15: https://www.bible.com/bible/111/REV.19.15.NIV
186) Revelation 20.4-6: https://www.bible.com/bible/111/REV.20.4-6.NIV
187) Revelation 20:7-9: https://www.bible.com/bible/111/REV.20.7-9.NIV
188) Thessalonians 2:3-8: https://www.bible.com/bible/111/2TH.22.3-8.NIV
189) John 5:28-29: https://www.bible.com/bible/111/JHN.5.28-29.NIV
190) Quran 5:116–117: https://quran.com/5/116-117

(جاری)

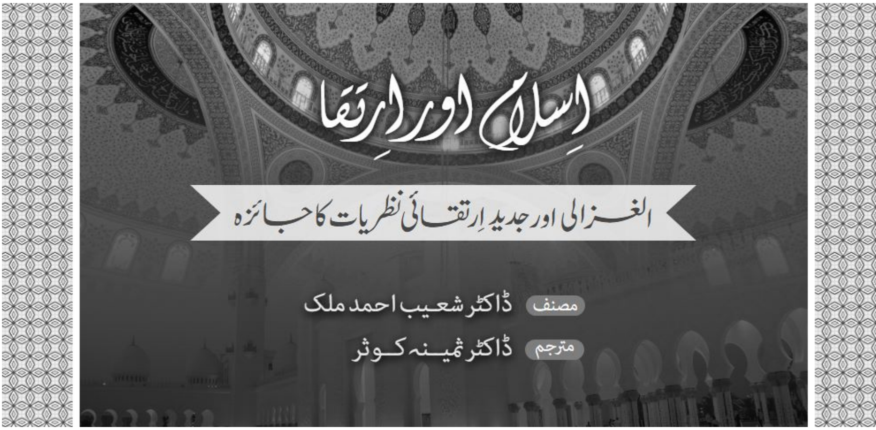

مسلم زاویہ فکر

اسلام اور نظریہ ارتقا کے علمی و تحقیقی مباحث میں جیسے جیسے وسعت اور ترقی آ رہی ہے، متعدّد آرا سامنے آ رہی ہیں۔ اس موضوع پر دنیا کے مختلف خطوں جیسے کہ امریکہ، ہندوستان، پاکستان، ترکی، مشرقِ وسطیٰ، ملیشیا اور ایران کے اہل علم کی آرا پر مشتمل تحریری سرمایہ دستیاب ہے (Ziadat 1986; Nadvi 1998; Hanioğlu 2005; Riexinger 2009; Howard 2011; Kaya 2011; Elshakry 2013; Bigliardi 2014; Ibrahim, and Baharuddin 2014; Bilgil 2015; Determann 2015; Varisco 2018; Ibrahim et al. 2019; Qidwai 2019; Daneshgar 2020)۔ چونکہ دائرہ بحث محدود ہے، اس سارے لٹریچر کا احاطہ ممکن نہیں۔ اس باب (اور باب دہم جہاں ان آرا کو امام غزالی کے ہرمنیوٹک فریم ورک کے تحت پرکھا جائے گا) میں کن اہلِ فکر کی آراء کو شامل کیا جائے، اس کے لیے تین اصول متعیّن کیے گئے۔

اوّل، معاصر اہلِ فکر کو ترجیح دی گئی۔ دوم، صرف ان اہل علم کا انتخاب کیا گیا جن کے نام سے اس موضوع پر خاطر خواہ علمی سرمایہ موجود ہے (سوائے ذاکر نائیک کے جنہیں ایک خاص وجہ سے استثنا دیا گیا)۔ بعض اہلِ علم نے ارتقا پر اپنی رائے محض ایک پیراگراف یا حاشیے میں بیان کی ہے، جس سے یہ متعیّن کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس پہلو سے اتفاق یا اختلاف کر رہے ہیں (کیا عمومی ارتقا سے؟ انسانی ارتقا سے؟ طویل زمانی تسلسل سے؟ یا میکینزم سے؟)۔ سوم، ان اہلِ فکر کو ترجیح دی گئی جن کے اندازِ استدلال یا طرزِ فکر میں نسبتاً انفرادیت پائی جاتی ہے، خواہ وہ ارتقا کو کسی درجے میں قبول کریں یا رد کریں۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک ہی موضوع پر اہلِ علم مختلف طرزِ استدلال سے کسی موقف تک پہنچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ آگے دیکھیں گے، بعض اوقات اہلِ فکر ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں لیکن ان کی بنیادیں اور طریقہ استدلال مختلف ہوتا ہے، اور وہ تطبیق یا عدمِ تطبیق کے الگ الگ طریقے اختیار کرتے ہیں۔

ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے کل بیس اہل فکر کا انتخاب کیا گیا ہے جیسا کہ اصل کتاب کے صفحہ 113 پر موجود جدول 4.3 میں درج ہے۔ ان میں تخلیقیت (Creationism) اور "کسی استثنا کے بغیر" (No Exceptions) کے زاویے میں آٹھ آٹھ اہلِ فکر شامل ہیں۔ انسانی استثنا (Human Exceptionalism) میں تین اہلِ فکر اور آدمی استثنا (Adamic Exceptionalism) میں ایک اہلِ فکر شامل ہیں۔ اس وضاحت کے بعد اب ان تمام زاویہ ہائے فکر کے نمائندہ اہلِ علم کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

تخلیقیت (Creationism)

اس مکتبِ فکر کے حامی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تمام جانداروں کی کوئی مشترکہ اصل (Common Ancestry) سرے سے موجود ہی نہیں۔ لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر اس نتیجے تک پہنچے ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر باب اوّل میں آ چکا ہے۔ بعض اہلِ فکر ارتقا کے رد میں کئی دلائل فراہم کرتے ہیں، جب کہ کچھ صرف ایک یا دو بنیادی باتیں پیش کرتے ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں جب ہم مختلف اہلِ فکر کی آرا کا جائزہ پیش کریں گے تو ایک مفکر کے اعتراضات کو دوسرے کے ضمن میں دہرانے سے گریز کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ کسی مشترک رجحان کو نمایاں کرنا مقصود ہو۔

ابتداءً بعض افراد ارتقا کو محض اس لیے رد کر دیتے ہیں کہ وہ اسے "بس ایک نظریہ" سمجھتے ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائیک کئی بار یہ بات دہرا چکے ہیں۔ وہ یہ فرض کرتے ہیں کہ لفظ "نظریہ" کا عام مفہوم اور سائنسی مفہوم ایک ہی ہے (Samuel and Rozario 2010; Gardner et al. 2018, 383)۔ بظاہر اس کی بنیاد یہ سوچ ہے کہ ارتقا اسلامی نصوص سے ہم آہنگ نہیں۔ اس لیے اگرچہ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ارتقا ایک غیر مضبوط یا خام مفروضہ ہے، لیکن اس کے پسِ پردہ مذہبی اسباب بھی کارفرما ہو سکتے ہیں۔ دیگر تخلیقیت پسند یا تو ذاکر نائیک کے طرزِ استدلال کو دہراتے ہیں یا پھر ارتقا کو ایک ناقابلِ اعتبار سائنسی نظریہ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ ان کے اعتراضات زیادہ تر امریکی تخلیقیت پسندوں کے اعتراضات سے مشابہ ہیں، جن پر باب دوم میں بحث ہو چکی ہے، لہٰذا انہیں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کچھ اہلِ فکر ارتقا کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ سائنسی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔ ایرانی و امریکی مفکر سید حسین نصر اور ان کے شاگرد، ملائشین مذہبی اسکالر عثمان بکر ارتقا کے سائنسی پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ مثلاً اس میں موجود اتفاقی میکانزم، نظریے میں پائے جانے والے خلا، بار بار ہونے والی تاریخی ترامیم جن سے یہ نظریہ مسلسل بحران کا شکار دکھائی دیتا ہے، اور حیات کے آغاز سے متعلق سائنسی مشکلات وغیرہ۔ تاہم ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ارتقا کو مابعد الطبیعیاتی بنیادوں پر بھی رد کرتے ہیں۔ دونوں ایک Neoplatonic تصورِ کائنات کے حامی ہیں جس کے مطابق

ماہیات جامد اور غیر متبدل ہیں۔ اس بنا پر ارتقا ممکن ہی نہیں۔ حسین نصر اس کی وضاحت ایک مثلث کی مثال دے کر کرتے ہیں: "مثلث مثلث ہی ہے اور کوئی چیز تدریجی طور پر مثلث میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جب تک ایک مثلث مکمل طور پر مثلث نہ ہو جائے، وہ مثلث نہیں ہے۔ اسی طرح جانداروں کی بھی اپنی اپنی حتمی صورت ہے" ,Nasr (2006 183)۔ عثمان بکر اس پیراڈائم کو مزید کھولتے ہیں:

ایک نوع (Species) دراصل خدا کے ذہن میں موجود ایک ''خیال'' ہے جو اپنی تمام ممکنات کے ساتھ ازل سے موجود ہے۔ یہ کوئی انفرادی حقیقت نہیں بلکہ ایک مثالی صورت (archetype) ہے، اور اسی لیے یہ نہ تو کسی حد کا پابند ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ یہ مثالی صورت سب سے پہلے لطیف درجے میں ظاہر ہوتی ہے، جہاں ہر فرد ایک ''صورت'' (form) اور ایک لطیف مادے کے ملاپ سے وجود میں آتا ہے۔ یہ ''صورت'' اس نوع کی بنیادی خصوصیات کا مجموعہ ہے جو اس کی غیر متبدل ماہیت کی جھلک ہوتی ہے۔ (Bakar (1984

چنانچہ حسین نصر اور عثمان بکر کے نزدیک ہر شے کی ایک مقررہ اور غیر متبدل مثالی صورت (archetype) ہے۔ اسی بنا پر وہ سمجھتے ہیں کہ ارتقا ممکن نہیں۔ البتہ واضح رہے کہ ان کا نقطہ نظر صغروی ارتقا (microevolution) کو تو رد نہیں کرتا، لیکن کبروی ارتقا (macroevolution) کو ناممکن قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مائیکرو ایوولیوشن (micro-evolution) کا امکان ضرور ہے، لیکن میکرو ایوولیوشن (macro-evolution) کا نہیں۔ مائیکرو ایوولیوشن دراصل کسی نوع کی مثالی صورت archetype یا form کے اندر ہی رہتے ہوئے تبدیلی ہے۔ جیسے کہ آپ اور میں انسان ہیں، اور چینی یا جاپانی لوگ بھی انسان ہیں۔ ہماری آنکھوں کی ساخت کچھ مختلف ہے، ان کی کچھ اور۔ اگر ہم زمبابوے جائیں تو ہماری جلد کا رنگ زیادہ سیاہ ہو جائے گا، اور اگر ہم سویڈن جائیں تو کچھ زیادہ سفید ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ انسان کی بنیادی صورت کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے۔ اس طرح کی چھوٹی تبدیلیاں مائیکرو ایوولیوشن ہیں۔ اسی طرح مکھیوں کا کچھ بڑی ہو جانا، یا روشنی کے مختلف اثرات کے تحت پودوں کا ردعمل ظاہر کرنا، ان کو بعض لوگ انواع کی تبدیلی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ یہ نوع کی تبدیلی نہیں بلکہ ایک ہی نوع کے اندر ہونے والی ارتقائی تبدیلی ہے۔ ہر نوع کی ایک وسعت اور دائرہ ہے جو اس نوع کے انفرادی وجود سے بڑا ہے۔ اسی لیے اس نوع میں مختلف افراد نئی خصوصیات کے ساتھ ظاہر ہو سکتے ہیں یا ماحولیاتی حالات کے مطابق بدل سکتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک نوع دوسری نوع میں تبدیل ہو گئی۔ (Nasr 2006, 184–185)

ان اعتراضات کے علاوہ، ان کے نزدیک ارتقا کے نظریے میں فلسفیانہ مسائل بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے بنیادی نکات naturalism اور reductionism کے مسائل ہیں۔ ارتقا ایک مادیت پرستانہ نظریہ ہے جو تخلیقی عمل میں خدا کے ہاتھ کو خارج کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ انسان کو، جو محض مادی وجود سے کہیں بڑھ کر ہے، صرف جینز اور ماحول کی پیداوار بنا دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ تمام چیزیں ارتقا کو مزید مشکل بنا دیتی ہیں:

یقیناً انسان کی زندگی بندر کی نسبت زیادہ پیچیدہ ہے، لیکن انسان میں وہ کچھ خصوصیات بھی ہیں جو ہمیں بندر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بندر سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔ اگر آپ اس کائناتی تصور میں کام کریں جہاں صرف مادی دنیا ہی موجود ہے جیساکہ جدید سائنس دعویٰ کرتی ہے، تو پھر کوئی چارہ نہیں کہ اعلیٰ حیات کو نچلی حیات کا ارتقا مانا جائے اور بالآخر سب کو مادی اجزا تک محدود سمجھا جائے۔ لیکن اگر آپ اس کائنات میں رہتے ہیں جہاں خدا کی منفرد تخلیقی قوت کو مانا جاتا ہے... تو پھر یہ تسلیم کرنا آسان ہے کہ وہی الٰہی قوت کسی بھی چیز کو پیدا کر سکتی ہے، زندگی بخش سکتی ہے اور انسانوں کو روح سے نواز سکتی ہے (Nasr 2006, 190–191)۔

تاہم ان تمام اعتراضات کے باوجود، ارتقا بنیادی طور پر اس لیے مشکل ہے کہ سید حسین نصر اور عثمان بکر نے ایک Neoplatonic نقطہ نظر اختیار کیا ہے (Bagir 2005, 49)۔ لہٰذا خواہ اس نظریے کے حق میں کتنا ہی سائنسی دباؤ موجود ہو، اور چاہے وہ سائنسی اعتراضات بھی کسی طور حل کر لیے جائیں جو انہوں نے ارتقا پر کیے ہیں، ان کا فکری تناظر اصلاً انواع کی کسی قسم کی تبدیلی کو ماننے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔

مظفر اقبال، جو ایک کیمیا دان سے متکلّم بنے، حسین نصر اور عثمان بکر کی یہی تشویش دہراتے ہیں۔ تاہم مظفر اقبال اسلامی روایت میں رائج نظم کے تصور پر بھی زور دیتے ہیں جو ارتقا کے کے نظریے میں پیش کیے گئے اتفاق پر مبنی تصور کے برعکس ہے۔ ان کے بقول:

ارتقا کے مختلف نظریات کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اتفاق پر انحصار کرتے ہیں، نہ کہ نظم (Design) پر۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ انواع (یا ان کے اعضا) کے ظہور میں کوئی ڈیزائن موجود نہیں اور ہر نوع اور ہر عضو تدریجاً کامل ہوتا گیا جیسا کہ ڈارون نے کہا، تو پھر نہ صرف ڈیزائن کو بلکہ اس ڈیزائن کے خالق کو بھی رد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس یہ دکھایا جائے کہ کامل اعضا اور انواع کا اتفاقی ارتقا ان کی پیچیدگی کی وجہ سے ممکن ہی نہیں، تو ڈارون کا نظریہ منہدم ہو جائے گا۔ ڈیزائن کے خلاف دلائل میں عموماً فطرت سے جمع کیے گئے بعض "حقائق" کو پیش کیا جاتا ہے اور یہ فرض کیا جاتا ہے کہ یہ سب حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن جب ان "حقائق" کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں تو یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ چاہے کتنا ہی باریک تجزیہ کر لیا جائے، بال ہمیشہ بال ہی رہے گا۔ بلاشبہ آج ہماری معلومات جسمانی دنیا کے بارے میں آٹھ سو برس پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہیں، لیکن ان میں زیادہ تر اضافہ مقداری نوعیت کا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے سائنسدان ان حقائق سے ناواقف نہیں تھے جنہیں آج کل کی نئی دریافتیں کہا جاتا ہے۔ صرف ایک ماخذ "کتاب الدلائل" نباتات، حیوانات، انسانی جسمانیات اور نفسیات سے سینکڑوں تفصیلات فراہم کرتی ہے جو ڈیزائن کے تصور کے حق میں بطور دلیل جمع کی گئی ہیں۔ اس روایت سے غایت درجہ کے دلائل لامحدود طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی علمی روایت نہ صرف اس ضرورت سے واقف تھی کہ ڈیزائن کے تصور کو اسلام کے بنیادی عقائد سے ہٹ کر ایک آزاد دلیل کے طور پر مرتب کیا جائے بلکہ اس نے اسے نہایت باریکی اور تکمیل تک پہنچایا

Muzaffar Iqbal (2008; 2009)۔

یہ حیرت کی بات نہیں کہ مظفر اقبال فطرت میں پائی جانے والی پیچیدگی کو بنیاد بنا کر "نظم و حکمت" کے دلائل کو مضبوط کرنے کے لیے Michael Behe اور William Dembski جیسے اہلِ فکر کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں جن کا ذکر ہم باب دوم میں کر چکے ہیں۔

وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کی ایسی تعبیرات جو ارتقا کے حق میں پیش کی جاتی ہیں، ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ خاص طور پر وہ ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو قرآن میں آدم کی تخلیق کو استعارہ یا علامتی طور پر بیان کیا ہوا سمجھتے ہیں (Iqbal 2009, 28)۔ اسی طرح وہ اس رویے پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ ارتقا کو قرآن کی کسی ایک آیت میں ڈال کر سمجھنے کی کوشش کی جائے، بغیر اس کے کہ پورے قرآن کو مجموعی طور پر سامنے رکھا جائے (Iqbal 2009, 33–34)۔ مثال کے طور پر یہ آیت دیکھیے:

جبکہ اُس نے تمہیں پیدا کیا درجہ بدرجہ (اَطواراً)" (القرآن 71:14)

بعض لوگوں نے اس آیت کو اس بات کے ثبوت کے طور پر لیا ہے کہ قرآن میں ارتقا کا تصور موجود ہے۔ لیکن اس طرزِ فکر پر سخت تنقید کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک جامع اور ہمہ گیر نصی شواہد پر مبنی نہیں ہے اور مسلمانوں کے گزشتہ چودہ سو سال کے متفقہ عقائد کے خلاف ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر وہ ارتقا کی کسی بھی دینی تعبیر، مثلاً theistic evolution (جس کا ذکر ہم نے باب دوم میں کیا تھا)، کی صحت پر سوال اٹھاتے ہیں (Iqbal 2010)۔ شیخ معبود بھی اس بحث میں تفسیری پہلو پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن بالکل واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ پودے، جانور اور انسان الگ الگ اور غیر تدریجی تخلیقات ہیں۔ پودوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

قرآن کے مطابق تمام قسم کے پودے، چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مشابہ کیوں نہ ہوں، الگ الگ پیدا کیے گئے ہیں۔ یعنی وہ وقت کے طویل عرصے میں ایک دوسرے سے ارتقا پذیر نہیں ہوئے، کیونکہ قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں ہے جو ارتقا کی طرف براہِ راست یا بالواسطہ اشارہ کرتی ہو۔ (Mabud 1991, 71)

وہ اپنے مؤقف کے ثبوت میں قرآن کی ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو الگ اور منفرد تخلیقات کے پیدا کیے جانے کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً یہ آیت:

وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھایا اور اس میں راستے بنائے، اور اس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی کے ذریعے ہم نے ہر قسم کے پودے اگائے۔ (القرآن 20:53)

جانوروں کے معاملے میں بھی شیخ معبود اسی طرح دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں کہیں بھی تدریجی تخلیق کا ذکر نہیں۔ یہ ان کے فکری ڈھانچے کا حصہ ہے جس کے مطابق قرآن کو عمومی اور مسلسل طور پر غیر ارتقائی انداز میں سمجھا جانا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

اگر ہم حیوانات کی دنیا میں ارتقا کو مان لیں، تو پھر ہمیں انسان کو بھی حیوانی سلسلے کا حصہ ماننا پڑے گا۔ لیکن اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ قرآن کے خلاف ہوگا...[اسی طرح] جب قرآن نے صراحت کے ساتھ نہ تو یہ کہا ہے کہ انسان ارتقا پذیر ہوا اور نہ یہ کہ پودے ارتقا پذیر ہوئے، تو پھر ہم جانوروں کے معاملے میں ارتقا کو کیوں قبول کریں (Mabud 1991, 73)۔

ایک اور جگہ وہ تخلیقیت کے ایک اور ثبوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جنّات کی مثال دیتے ہیں، جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہ دھوئیں سے پیدا کیے گئے (القرآن 55:15)۔ اس پر لکھتے ہیں:

یہ ایک بالکل واضح مثال ہے ایسی مخلوق کی جو الگ اور منفرد طور پر پیدا کی گئی، کسی پہلے سے موجود نوع کے ذریعے ارتقا کے عمل سے نہیں بلکہ براہِ راست مادّے سے ایک غیر مسلسل (discontinuous) طریقے سے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی theistic evolution کا حامی جنّات کی اصل کو ایبا سے جوڑنے کی کوشش نہیں کرے گا (Mabud 1991, 74)۔

چنانچہ شیخ معبود کے نزدیک یہ بالکل واضح ہے کہ قرآن کسی بھی طرح کی تدریجی تخلیق کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ ایک واضح تخلیقیت پر مبنی تصورِ کائنات پیش کرتا ہے۔ اسی تناظر میں وہ آدمؑ کی تخلیق کو ایک معجزہ مانتے ہیں، جو والدین کے بغیر ہوئی اور جس سے انسان وجود میں آئے۔

شامی سنّی عالم محمد سعید رمضان البوطی بھی نظریہ ارتقا کے سخت ناقد کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کے نزدیک اس نظریے پر دو بنیادی اعتراضات ہیں: ایک نقلی (scriptural) اور دوسرا سائنسی (2017, 311–342)۔ سائنسی پہلو سے وہ وہی نکات دہراتے ہیں جو پہلے بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ ارتقا محض ایک نظریہ ہے۔ نقلی پہلو سے البوطی آدمؑ کی تخلیق کے قصے کو، جس پر باب سوم میں گفتگو ہو چکی ہے، حرفِ آخر مانتے ہیں۔ وہ قرآن میں انسان کی انفرادیت اور شرافت کو بھی اجاگر کرتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے:

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور انہیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا، اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا، اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی۔ (القرآن 17:70)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔ (القرآن 95:4)

البوطی ان آیات کو ایسے دلائل کے ساتھ جوڑتے ہیں جیسے انسانی روح کی انفرادیت اور وہ عقلی صلاحیتیں جو صرف انسان کو حاصل ہیں (Al-Būṭī (2017, 314۔ مزید برآں، وہ دیگر آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کی تمام چیزیں انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں:

اور اُس نے آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، یہ سب کچھ اُس کی طرف سے تمہارے لیے عطیہ ہے۔ بیشک اس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (القرآن 45:13)

مجموعی طور پر یہ باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انسان ایک برتر مخلوق ہے، اور اسی بنیاد پر الہوطی انسان کی اصل کو ارتقائی عمل سے خارج قرار دیتے ہیں، خصوصاً جب وہ نظریہ ارتقا کو ایک سائنسی نظریہ کے طور پر منفی انداز میں جانچتے ہیں۔

بھارت کے معروف متکلّم محمد شہابُ الدین ندوی نے دعویٰ کیا کہ ارتقا محض ایک افسانہ ہے (1998، ص 20-22)۔ مزید یہ کہ انہوں نے کہا کہ ارتقا دراصل یہودی ذہن کی پیداوار ہے جو ایک خفیہ صیہونی ایجنڈے کے ساتھ جڑا ہوا ہے، وہ لکھتے ہیں:

سائنس دانوں سے بڑھ کر دہریت کے حامی اور ان کی تنظیمیں نظریہ ارتقا کی پشت پناہی میں سرگرم رہی ہیں۔ یہاں تک کہ مارکسسٹ، صیہونی اور فری میسن بھی اس کام کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ یہود ہمیشہ سے مذہب اور مذہبی اقدار کو جڑ سے اکھاڑنے کے خواہاں رہے ہیں۔ دنیا پر حکمرانی کی خفیہ تمنا وہ مدتوں سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کے پروٹوکول اس دیرینہ خواب کی گواہی دیتے ہیں۔ اسی مقصد نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کو ختم کرنے اور تمام الحادی ولادینی عقائد، مادی فلسفوں اور مختلف "ازموں" کو فروغ دینے میں سرگرم ہوں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر قوم کی اخلاقی بنیادوں پر کاری ضرب لگانا ضروری ہے۔ اگر عالمی فکری منظرنامے پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں میں یہود اس پر حاوی رہے ہیں۔ کارل مارکس، جو مارکسزم کا بانی تھا؛ فرائڈ، جس نے جنسی آزادی کی حمایت کی؛ اور ڈرکھائم، جس نے اجتماعی مادیت کا تصور پیش کیا، یہ سب یہودیوں میں سے اٹھے۔ اگرچہ ڈاروِن یہودی نہیں تھا، لیکن اس کا نظریہ ارتقا یہودی منصوبے میں بخوبی فٹ بیٹھتا تھا۔ اسی لیے یہود اس کے سب سے بڑے مبلغ بن گئے۔ ڈارون ازم اور مارکس ازم کی ترویج صیہونی ایجنڈے میں اعلیٰ ترین ترجیح کی حیثیت رکھتی تھی اور اسے ان کے پروٹوکول میں بطور لازمی شق شامل کیا گیا (1998، ص 20-24)۔

انہوں نے آدمؑ کی تمثیلی (allegorical) تعبیرات کے خلاف بھی استدلال کیا۔ ان کے نزدیک آدم ایک تاریخی شخصیت ہیں اور قرآن اس حقیقت کو بالکل واضح کرتا ہے۔ اس کے برعکس کہنا ایسے نتائج کو جنم دیتا ہے جن میں اسلام کے دیگر انبیا کو بھی محض اساطیری حقیقت قرار دینا شامل ہے (ندوی 1998، ص 107–116)۔

ذیل کی آیات پر غور کیجیے جن میں آدم کا ذکر نوح، ابراہیم اور عیسیٰ کے ساتھ آیا ہے:

اللہ نے آدم کو، نوح کو، آلِ ابراہیم کو اور آلِ عمران کو تمام جہان والوں پر چن لیا۔ (القرآن 3:33)

بیشک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے: اللہ نے اسے مٹی سے بنایا، پھر اس سے کہا 'ہو جا' تو وہ ہو گیا۔ (القرآن 3:59)

ندوی اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ اگر آدم کو تمثیل کے طور پر تعبیر کیا جائے، تو پھر ان آیات میں مذکور دیگر انبیاء کو تمثیل ماننے سے کیا چیز روکے گی؟ آدم کو تمثیل کہنا اور باقی انبیاء کو تاریخی ماننا ایک بے اصول، وقتی اور من مانی تعبیر ہوگی جو

فکری تضاد اور عدمِ تسلسل کو جنم دیتی ہے (1998، ص 99–106)۔

آخر میں، ہارون یحییٰ، جو عدنان اوکطار "Adnan Oktar" کا قلمی نام ہے، ایک خود ساختہ ترک مبلغ ہیں جو ارتقا اور اس کی اسلام سے عدم مطابقت پر کئی مشہور کتابیں شائع کرنے کے بعد شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ ان کی کتابوں میں The Atlas of Creation اور The Evolution Deceit (Solberg 2013) شامل ہیں۔

اب تک زیرِ بحث آنے والے تمام مفکرین میں، ہارون یحییٰ ارتقا کو تسلیم نہ کرنے کے سب سے زیادہ متنوع دلائل پیش کرتے ہیں۔ وہ سائنس کو سرے سے رد کر دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ارتقا کے حق میں دیے جانے والے ہر ثبوت، چاہے وہ فوسل ریکارڈ ہوں، مالیکیولر بایولوجی ہو یا ہمولوجی "homology" وغیرہ، اپنے معیار پر بار بار ناکام ثابت ہوتے ہیں (Yahya 2001a; 2003a; 2006a)۔ مزید یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ارتقا بذاتِ خود ایک "قدرت پرستانہ" (naturalistic) نظریہ کائنات ہے جو اسلامی زاویہ نظر کے خلاف ہے۔

یحییٰ ارتقا کے فکری ماخذ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس نظریے کی بنیاد دراصل یونانی فلاسفہ کے pagan origins سے جڑتی ہے، جہاں زندگی کی ابتدا کو ماورائی یا الوہی تناظر میں نہیں بلکہ خالصتاً مادی اصولوں کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یحییٰ کے نزدیک اس تاریخی تناظر سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ارتقا کا فکری ڈھانچہ ابتداء ہی سے ایک naturalistic worldview پر قائم ہے، جو اسلامی تصورِ کائنات کے ساتھ بنیادی طور پر ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے وہ واضح طور پر اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ chance-like mechanisms یعنی محض اتفاقیہ عوامل کے ذریعے حیات اور کائنات کی تشکیل، اسلامی عقیدے سے سِرے سے متناقض ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک صاحبِ ایمان مسلمان کے نقطۂ نظر سے جب اس مسئلے پر غور کیا جائے اور قرآنِ حکیم کی تعلیمات کو رہنما بنایا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ کوئی بھی ایسا نظریہ جو اپنی اساس میں chance پر مبنی ہو، اسلامی تصورِ تخلیق کے ساتھ کسی درجے میں بھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ نظریۂ ارتقا کے مطابق زندگی کی تشکیل وارتقاء میں chance، وقت اور بے جان مادہ فیصلہ کن عناصر ہیں، اور یوں انہیں عملاً خالق کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک pagan-based theory ہے جو مادی اور غیر شعوری عوامل کو تخلیقی حیثیت عطا کرتی ہے، اور یہ بات کسی بھی مسلمان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی، کیونکہ اسلامی عقیدہ اس بنیاد پر استوار ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد خالق ہیں جو عدم سے وجود میں لاتے ہیں۔ اس تناظر میں ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ سائنس اور عقل دونوں کو بطورِ آلہ استعمال کرتے ہوئے ہر اس نظریے اور فکر کی تردید کرے جو اس بنیادی ایمانی حقیقت سے متعارض ہو (Yahya 2003b, 33–34)۔

اس نکتے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے، ہارون یحییٰ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نظریہ ارتقا دراصل چارلس ڈارون کی اختراع ہے، جو ایک دہریہ تھا۔ ہارون یحییٰ یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ ڈارون نے اپنے عدمِ ایمان کو اس لیے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تاکہ اس کا نظریہ خدا کے انکار کی روشنی میں کسی رکاوٹ کے طور پر نہ دیکھا جائے۔ یہ پہلو ہارون یحییٰ کے

نزدیک خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ وہ دہریت اور ارتقا کو ایک ہی سکے کے دو رُخ سمجھتے ہیں، اس طرح کہ ڈارون کے نظریے کی حمایت دراصل دہریت کی تائید کے مترادف ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے دہریہ مفکرین ڈارون کے حامی رہے ہیں اور لادینی نظریات نے محض اس کی دہریت کی وجہ سے ڈارون ازم کو تقویت بخشی ہے۔ اس لیے ڈارون کے دہریہ ہونے کے اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کو یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اسے مذہبی یا کم از کم مذہب کے مخالف نہ سمجھیں، اور پھر اس کی ذات، اس کے نظریے یا اس جیسے دوسرے خیالات کی حمایت کرتے رہیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو عملاً اپنے آپ کو دہریوں کی صف میں شامل کرلیں گے (Yahya 2003, 54–56)۔

اسی لیے یہ حیرت کی بات نہیں کہ ہارون یحیی نے اپنی بعض تصانیف میں Intelligent Design (ID) کی تحریک سے متعلق لٹریچر سے استدلال کیا ہے۔ مظفر اقبال کی طرح وہ بھی اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لیے Michael Behe کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہارون یحیی کا کہنا ہے کہ ارتقا نے ماضی کے مختلف سماجی و سیاسی "ازموں" کو جنم دینے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

گزشتہ تقریباً ایک صدی کے فکری و سماجی رجحانات، جن میں کمیونزم، فاشزم، کیپٹلزم اور نسلی امتیاز شامل ہیں، کو ہارون یحییٰ ارتقائی فکر کی پیداوار قرار دیتے ہیں اور اسی کو دنیا میں اخلاقی زوال کا بنیادی سبب بھی بتاتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہارون یحیی تخلیق پر مبنی قرآنی بیانیے کے مطالعہ پر زور دیتے ہیں اور اس میں ارتقائی تصور کو تلاش کرنے کی کسی بھی کوشش کو رد کردیتے ہیں۔ تاہم یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ وہ ارتقا کے سخت ناقد ہیں، پھر بھی وہ اس امکان کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہیں تو زندگی کو ارتقائی عمل کے ذریعے بھی تخلیق کر سکتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک موجودہ دلائل، خواہ وہ وحی سے ماخوذ ہوں یا سائنسی تحقیق سے، اس نتیجے تک پہنچنے کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتے (Yahya 2003, 108–109)۔

تخلیق پسند مکتبِ فکر کے اس جائزے کو ہم یہیں سمیٹتے ہیں۔ اس مختصر بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مختلف مفکرین نے ارتقا کو رد کرنے کے لیے نہایت متنوع دلائل پیش کیے ہیں۔ ان میں کہیں سائنسی دلائل ہیں، کہیں فلسفیانہ و الٰہیاتی استدلال، کہیں تفسیری توضیحات، اور بعض اوقات سماجی و سیاسی بنیادیں بھی۔ بعض نکات پر ان کے افکار میں اشتراک پایا جاتا ہے، مثلاً آدم کی تمثیلی تعبیر کو ناقابلِ قبول قرار دینا؛ جبکہ کئی مواقع پر وہ ایک دوسرے سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ہی علمی دائرے میں استدلال کرنے والے مفکرین کے مابین بھی زاویۂ نظر اور ترجیحات میں فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، کچھ اہلِ فکر ارتقا کو محض اس بنیاد پر رد کرتے ہیں کہ یہ صرف "ایک نظریہ" ہے، جیسا کہ ذاکر نائیک؛ جبکہ دیگر، جیسے ہارون یحییٰ، اس کے خلاف سائنسی اعتراضات کا ایک منظم اور تفصیلی مجموعہ پیش کرتے ہیں۔

(جاری)

اعلامیہ

الحمد اللہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلاۃ والسلام علیٰ خاتم الانبیاء والمرسلین، وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین، اما بعد:

آج بتاریخ 3 اگست 2025، بروز اتوار، بمقام: مرکز قرآن و سنہ (53 لارنس روڈ) لاہور، پاکستان "رسول کریم ﷺ، صحابہ کرام و اہلِ بیت عظام اور شعائر اسلامیہ کی توہین، تنقیص اور تعریض کی شرعی و قانونی حیثیت" کے عنوان پر تمام مکاتب فکر کے علماء و مشائخ اور تمام جماعتوں کے قائدین کا یہ متفقہ اعلامیہ پیشِ خدمت ہے:

اسلام کتاب و سنت کا نام ہے۔ کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونا، اس کی نشر و اشاعت اور غالب کرنے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا بنیادی دینی فریضہ ہے۔ فروغِ اسلام اور حفاظتِ دین کے لیے کتاب و سنت کی روشنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر ملتِ اسلامیہ کا منہاج ہے۔ حفاظتِ دین کے پیشِ نظر تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ، دفاعِ صحابہ و اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور تعظیمِ شعائرِ اسلام کی جدوجہد واجباتِ شرعیہ میں سے ہے۔

1- ناموسِ رسالت ﷺ اور منصبِ نبوت کا تحفظ

(۱) خاتم الرسل والانبیاء ﷺ کو ہر قسم کے نظریات و شخصیات پر مقدم رکھنے اور غیر مشروط محبوب و مطاع ماننے اور ثابت کرنے کی جدوجہد؛ ناموسِ رسالت و منصبِ رسالت پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

(۲) حدیثِ نبوی کی حجیت کا واضح انکار کرنا، کلی انحراف یا استہزا، توہینِ نبوت کے مترادف اور منصبِ نبوت پر ڈاکہ زنی ہے۔ ایسا کرنے والا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کے مسلّمات اور اجماعِ امت کے خلاف محاذ آرائی سراسر گمراہی ہے۔ اس کے بالمقابل کنایۃ جزوی طور پر انکار کرنے والا گمراہ ہے۔

(۳) شانِ رسالت میں صراحۃً وِارادۃً توہین، تنقیص اور تعریض[1] کرنا کفر، ارتداد، عہد شکنی اور دین دشمنی ہے جس کا مرتکب شرعی اعتبار سے سزائے موت[2] کا حق دار ہے، البتہ اس سزا کا اختیار عدالت اور حکومت کو حاصل[3] ہے۔

2-توہینِ رسالت کے مجرموں کی فوری سزا

(۱) حالیہ بلاسفیمی سازش کا سدباب کرنا، پاکستان مسلم حکومت کی ذمہ داری ہے۔

(۲) توہینِ ناموسِ رسالت ﷺ کو روکنے اور عالمی سطح پر اسے جرم تسلیم کروانے کے لئے حکومت کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

(۳) جن مجرموں کو سزا سنائی جا چکی ہے، اس پر فوری عمل کیا جائے۔

(۴) توہینِ مقدسات سے متعلقہ زیر سماعت مقدمات کا فوری فیصلہ کیا جائے۔

(۵) قانون توہینِ رسالت کو غیر مؤثر بنانے اور ترمیم کرنیوالے پروٹیکشن گروپ کی اندرونی و بیرونی فنڈنگ کو بند کیا جائے اور سوشل میڈیا وغیرہ پر ایسے توہین آمیز مواد اور اس کو پھیلانے والے عناصر پر فوری پابندی لگائی اور قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۶) اس مسئلے کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر بین المسالک تحفظِ شعائر اللہ فورم قائم کر کے متحرک کیا جائے۔

3-مقامِ صحابہؓ واہلِ بیتؓ

(۱) انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جملہ صحابہ کرام واہل بیت عظام رضی اللہ عنہم واجب الاحترام اور افضل ترین[4] نفوسِ قدسیہ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے سید المرسلین ﷺ کی رفاقت[5]، تبلیغ اور اقامتِ دین کے لیے چنا۔

(۲) وہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا بہترین ثمر، اللہ کی جماعت[6] اور معیارِ ایمان[7] ہیں۔

(۳) ان کو مغفرتِ ذنوب[8] اور جنت کی حتمی بشارتیں، الفائزون، المفلحون، رضی اللہ عنہم، وکلا وعد اللہ الحسنیٰ[9] کی سندیں حاصل ہیں۔

(۴) اگرچہ ان کے ایمانی اور اُخروی درجات میں تفاوت ہے، جیسا کہ خلفائے راشدین[10]، عشرہ مبشرہ[11]، اہلِ بیت[12]، اصحابِ بدر اور اصحابِ شجرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔ یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ سے راضی اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔

(۵) وہ تفسیر، حدیث، فقہ، اور علم وعمل کے ہر شعبہ میں سب سے بڑے اور اولین امام[13] ہیں۔

(۶) صحابہ کرام واہلِ بیت رضی اللہ عنہم نبوت کے عینی گواہ اور سفیر ہیں، نزولِ قرآن کے اولین مخاطب، حاضرینِ مجلس اور براہ راست دین سمجھنے والے اور عدالت وامانت کے ساتھ اسے آگے نقل کرنے والے ہیں۔

(۷) ملتِ اسلامیہ کو انہی کی بیان کردہ روایاتِ دین کے ذریعے اسلام اور اس کے جملہ احکام و اعمال کی نعمت ملی۔ لہٰذا ان کے بعد ہونے والی تمام نیکیوں کا اجر ان کو ملتا[14] ہے۔

(۸) صحابہ کرام و اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی اتباع کرنے والے محدثین، مفسرین، فقہاء، زہاد؛ اہل السنہ والجماعہ اور ملتِ اسلامیہ کے مقتدیٰ اور رہنما ہیں۔

(۹) صحابہ کرام و اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا روایتِ دین اور فکر و عمل میں منہج اختیار کرنا اسلام کی اساس ہے۔

(۱۰) جنتی گروہ صرف وہی ہے جو صحابہ کرام و اہلِ بیت عظام رضی اللہ عنہم کے راستے[15] پر رہے۔

4- صحابہؓ و اہلِ بیتؓ کے متعلق اہل السنہ والجماعہ کا اجماعی عقیدہ

(۱) تمام صحابہ کرام اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم عادل[16] اور امین ہیں۔

(۲) ان سے محبت کرنا دین[17]، ایمان، احسان[18] اور شرعی فریضہ ہے۔

(۳) وہ رسول کریم ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب[19] ہیں، ان سے بغض رکھنا اللہ کے غیظ و غضب اور قہر و عذاب کا موجب ہے۔

(۴) سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا طلحہ، سیدنا زبیر، سیدنا حسن، سیدنا حسین، سیدنا ابوسفیان، سیدنا معاویہ، سیدنا عمرو بن عاص، سیدنا مغیرہ بن شعبہ، سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا ابوموسیٰ اشعری، سیدہ عائشہ و دیگر اُمہات المومنین اور جمیع صحابہ کرام و اہلِ بیت عظام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی شان میں کسی بھی پلیٹ فارم پر صراحتاً یا اشارۃً توہین، تنقیص اور تعریض کرنا کفر، نفاق، طغیان اور اسلام میں طعنہ زنی و دین دشمنی ہے۔

(۵) ان پر تبرا کرنا، تہمت لگانا[20]، تکفیر کرنا، اعتراضات اٹھانا اور ان کی عدالت و ثقاہت کی بابت شبہات[21] پیدا کرنا؛ ایمان کے منافی، امتِ مسلمہ کے اجماعی عقیدہ سے انحراف، موجبِ فسق و نفاق اور بدعت و ضلال ہے۔

(۶) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلافات کو بنیاد بنا کر ان میں سے کسی کی توہین و تنقیص اور تعریض کرنا سراسر باطل عمل اور واضح گمراہی[22] ہے اور اپنے اختلافات میں ہر دو طرف کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علم، اخلاص اور خیر خواہی کی بنیاد پر مجتہد ہونے کے ناطے سے اکہرے یا دوہرے اجر سے کبھی محروم[23] نہیں رہے۔

5- صحابہ کرامؓ و اہلِ بیتؓ کی توہین و تنقیص کرنے والا سنگین سزا کا مستحق ہے!

(۱) صحابہ کرام و اہلِ بیت عظام رضی اللہ عنہم کی صراحتاً و کنایتاً توہین و تنقیص؛ شرعی[24] قانونی سزا کی موجب ہے۔

(۲) تاریخِ اسلامیہ میں ایسے بدبختوں کو ہمیشہ سنگین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

(۳) اکثر بلادِ اسلامیہ میں نافذ العمل قوانین کی طرح پاکستان میں قانونی عمل کو مکمل کیا جائے۔

(۴) پاکستانی اسمبلیوں میں ناموسِ صحابہؓ واہلِ بیتؓ بل 1993، تحفظِ بنیادِ اسلام بل 2020 پیش ہوئے ہیں۔ تحفظِ ناموسِ صحابہؓ واہلِ بیتؓ ایکٹ 2023 وغیرہ منظوری کے بعد ایوانِ صدر میں دستخط نہ ہونے کی بنا پر دو سالوں سے التوا کا شکار ہے، جس کو مکمل کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گستاخوں پر شرعی اور قانونی سزا فوری نافذ کی جائے۔

6- صحابہؓ واہلِ بیتؓ کی توہین، تنقیص اور تعریض کرنے والا

(۱) صحابہؓ واہلِ بیتؓ کی توہین، تنقیص اور تعریض کرنے والا؛ اہل السنہ کے منہج، مسلّمات، اجماعی عقائد سے منحرف ہے اور گمراہ ہے، اس کا اہلِ سنت سے کوئی تعلق نہیں! خواہ وہ کوئی عام آدمی ہو یا کوئی خطیب و واعظ اور ذمہ دار ہو، یا کسی ادارے، تنظیم اور جماعت کا فرد ہو۔

(۲) ایسے ہر شخص کی تمام سُنی مکاتبِ فکر ہر مجلس میں خوب سرزنش اور مکمل بائیکاٹ کریں۔

(۳) نصیحت کے لوازمات مکمل کر کے توبہ پر آمادہ کیا جائے، بصورت دیگر شرعی و قانونی سزا کے اقدامات کریں۔

7- اہل السنہ والجماعہ کا منہاج افراط و تفریط سے پاک ہے!

(۱) ہم رافضیوں (شیخینؓ یا کسی بھی صحابیؓ سے بغض و عداوت رکھنے والوں) اور ناصبیوں (اہلِ بیت سے بغض اور دشمنی رکھنے والوں) اور ان کے ہم نواؤں کے فکر و عمل سے کھلا اظہارِ براءت[25] کرتے ہیں اور ان کی مجلسوں میں شرکت کی سختی سے نفی کرتے ہیں۔

(۲) نواسۂ رسول اور نوجوانانِ جنت کے سردار سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر ظلم و بربریت ڈھانے والوں کے بارے میں ہمارا وہی موقف ہے جو اہلِ سنت کے سرخیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے:

”واما من قتل الحسین او اعان علیٰ قتلہ او رضی بذلک فعلیہ لعنۃ اللہ و الملائکۃ والناس اجمعین، لایقبل اللہ منہ صرفاً ولا عدلاً۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ: 487/4)

”جس نے بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، یا ان کی شہادت میں کسی طرح کی کوئی مدد کی، یا ان کی شہادت پر وہ کسی درجے میں خوش ہوا؛ تو اس پر اللہ، ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی فرضی اور نفلی عبادت قبول نہ فرمائے۔“

8- تحفظِ شعائرِ اسلام

(۱) شعائر اللہ اسلام کے ستون اور نظریاتی سرحدیں ہیں۔ قرآن، حرمین شریفین، مساجد، ارکانِ اسلام، قربانی، داڑھی اور حجاب و پردہ وغیرہ؛ دینِ اسلام کی پہچان اور امتیازی علامتیں ہیں، جن کی تعظیم تقویٰ کا تقاضا[26] اور ان کی بے حرمتی صریحاً گمراہی اور بہت بڑی نافرمانی ہے۔

(۲) شعائرِ اسلام میں سے کسی ایک کی بھی صراحۃً وارادۃً تحقیر و تضحیک اور استہزا و تمسخر [27]: اسلام کی اساسیات پر حملہ اور انہیں مسمار کرنا ہے، جو کہ موجبِ ارتداد و کفر یا باعثِ فسق و نفاق ہے۔

(۳) بالخصوص قرآن کریم کی اہانت کرنا صریح کفر ہے [28]، جیسے اسے گندگی میں پھینکنا، روندنا، مذاق اڑانا، شرمناک جگہوں پر لکھنا وغیرہ۔

(۴) اسی طرح مساجد میں فلمیں بنانا، انہیں تفریحی مقام سمجھنا [29] اور ان میں مرد و زن کا فحش حرکات کرنا [30] مسجد کے تقدس کے منافی ہے۔

(۵) موجودہ عالمی ماحول میں آزادیٔ اظہار کے نام پر اسلام اور اس کے شعائر کو تضحیک، تحقیر اور تمسخر کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، جو دراصل امتِ مسلمہ کی دینی شناخت پر حملہ ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے ہر دور میں شعائرِ دین کے تحفظ کو جان و مال سے مقدم رکھا؛ یہ صرف جذباتی غیرت نہیں بلکہ ایمانی ذمہ داری اور اسلامی شعور کا مظہر ہے [31]۔ لہٰذا اس کا دفاع واجب ہے، کیونکہ ان کی بے حرمتی سے تعلیماتِ شرعیہ کے تشخص کا خاتمہ ہوتا ہے، تہذیبِ اسلامی کا وقار ختم ہوتا ہے اور دین کے اصولوں اور اساسیات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

تجاویز و سفارشات

(۱) تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ، دفاعِ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم اور تعظیمِ شعائرِ اسلام کی جدوجہد واجباتِ شرعیہ میں سے ہے اور ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔

(۲) رسول کریم ﷺ کی توہین، تنقیص اور تعریض کرنا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہونے کا سبب ہے، مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے اور وطنِ عزیز کے امن کو خراب کرنے کا باعث ہے۔

(۳) صحابہ کرام و اہلِ بیت عظام رضی اللہ عنہم اور شعائرِ اسلام کی توہین، تنقیص اور تعریض کرنا صریحًا گمراہی ہے اور بین المسالک فساد پیدا کرنے کی ناپاک کوشش ہے۔

(۴) حدیثِ نبوی کی حجیت کا واضح انکار کرنا، کلی انحراف یا استہزاء؛ توہینِ نبوت کے مترادف اور منصبِ نبوت پر ڈاکہ زنی ہے۔ ایسا کرنے والا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہے، اس طرح کتاب و سنت کے مسلّمات اور اجماعِ امت کے خلاف محاذ آرائی سراسر گمراہی ہے۔

(۵) حالیہ بلاسفیمی کیسز میں سازش کا سدباب کرنا پاکستان مسلم حکومت کی ذمہ داری ہے۔

(۶) توہینِ ناموسِ رسالت کو روکنے کے لیے عالمی سطح پر اسے جرم تسلیم کروانے کے لیے حکومت کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

(۷) بلاسفیمی کیسز میں جن مجرموں کو سزا سنائی جا چکی ہے، اس پر فوری عمل کیا جائے۔

(۸) توہین سے متعلقہ زیر سماعت مقدمات کا فوری فیصلہ کیا جائے۔

(۹) قانونِ توہینِ رسالت کو غیر مؤثر بنانے اور ترمیم کرنے والے پروٹیکشن گروپ کی اندرونی و بیرونی فنڈنگ کو بند کیا جائے اور سوشل میڈیا وغیرہ پر ایسے توہین آمیز مواد اور اس کو پھیلانے والے عناصر پر فوری پابندی لگائی جائے اور قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۱۰) اس مسئلے کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر بین المسالک ”تحفظِ شعائر اللہ فورم“ قائم کر کے متحرک کیا جائے۔

(۱۱) حکومت سے اپیل کی جاتی ہے کہ اس مسئلے کی حساسیت کے پیشِ نظر اسی قدر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا جائے اور شعائر اللہ کی تعظیم و تقدیس کو یقینی بنایا جائے۔

(۱۲) بین المسالک تحفظِ شعائرِ اسلام فورم بنایا جائے جو شرعی قانون سازی کروانے اور پہلے سے موجود قوانین پر عمل درآمد کی مؤثر تحریک چلائے۔

(۱۳) اس حوالے سے عوامی سطح پر موجود شکوک و شبہات کے تدارک کے لئے علماء و داعیانِ دین کی تحقیقی مجالس کا انعقاد کرے۔

(۱۴) علمائے کرام رفعِ شبہات کی بابت علمی و تحقیقی کتب، مضامین اور تعلیمی اداروں کے لیے نصابی لٹریچر تیار کریں۔

(۱۵) جبکہ داعیانِ دین دفعِ شبہات کے لیے تمام اسباب و ذرائع؛ خصوصاً سوشل میڈیا کے پلیٹ فارمز پر ریلیز، شارٹ کلپس اور پوڈ کاسٹس کے ذریعے مضبوط جدوجہد کریں۔

متفرق قراردادیں

- توہینِ رسالت کے مرتکبین کی سہولت کاری اور قانونِ توہینِ رسالت کو غیر مؤثر بنانے کے لیے عدالتی کمیشن بنانا سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی ہم نوائی ہے۔
- تمام پرائیویٹ یا سرکاری تعلیمی اداروں میں طلبہ پر تشدد ناقابلِ برداشت ہے۔
- جرگے اور پنچایت کے حکم پر غیرت کے نام پر قتل کرنا ظلم و زیادتی ہے، جس کی ہم مذمت کرتے ہیں۔

قرآن و سنت، آثار صحابہ کرامؓ اور اقوالِ ائمہ اسلاف مع حوالہ جات

1- شیخ الاسلام ابن تیمیة: ما ہو السب؟: ”الکلام الذی یقصد بہ الانتقاص والاستخفاف وہو ما یفہم منہ السب فی عقول الناس علی اختلاف اعتقاداتہم کاللعن والتقبیح ونحوہ... (الصارم المسلول لابن تیمیہ: ص 561) والکلمة الواحدة تکون فی حال سبا وفی حال لیست بسب فعلم

ان ہذا یختلف باختلاف الاقوال والاحوال واذا لم یکن للسب حد معروف فی اللغة ولا فی الشرع، فالمرجع فیہ الی عرف الناس فما کان فی العرف سبا للنبی فھو الذی یجب ان ننزل علیہ کلام الصحابۃ والعلماء وما لا فلا۔ (ص 541)

+ قاضی عیاض (م544ھ) نے بھی الشفاء بتعریف حقوق المصطفی ﷺ میں 'توہین' کی ایک تعریف درج کی ہے۔ (932/2) تاہم مذکورہ تعریف زیادہ بہتر ہے۔

2- ابن المنذر: ''اجمع عوام اہل العلم علی ان من سب النبی ﷺ القتل۔'' (الاشراف لابن المنذر: 60/8)

+ ابوبکر الفارسی: ''اجمعت الامۃ علی ان من سب النبی ﷺ یقتل حدا'' (السیف المسلول للسبکی: 156)

3- الامام الشافعی: ''لا یقیم الحد علی الاحرار الا الامام ومن فوض الیہ الامام۔''

+ الامام النووی: لا یقیم الحد علی الاحرار الا الامام ومن فوض الیہ الامام، لانہ لم یقم حد علی حر علی عہد رسول اللہ ﷺ الا باذنہ ولا فی ایام الخلفاء الا باذنہم، ولانہ حق للہ تعالی یفتقر الی الاجتہاد ولا یؤمن فی استیفائہ الحیف فلم یجز بغیر اذن الامام۔ ('المجموع' للنووی: 34/20، اور 448/18)

+ ابوبکر الکاسانی الحنفی: ''واما شرائط جواز اقامتہا یعنی الحدود ... فہو الامامۃ ان یکون المقیم للحد ہو الامام او من ولاہ الامام۔ (بدائع الصنائع: 57/7)

+ ابن تیمیۃ: ''خاطب اللہ المؤمنین بالحدود والحقوق خطابا مطلقا ... ہو فرض علی الکفایۃ من القادرین و ''القدرۃ'' ہی السلطان؛ فلہذا: وجب اقامۃ الحدود علی ذی السلطان ونوابہ۔ (مجموع فتاوی ابن تیمیہ: 176/34)

+ نابینا صحابی کا اپنی باندی کو خود توہین کرنے پر سزائے قتل دینے کی شیخ ابن تیمیہ نے چھ توجیہات پیش کی ہیں۔ (الصارم المسلول: ص 285)

4- قال النبی ﷺ: «انتم خیر اہل الارض» وکنا الفا واربع مائۃ ...» (صحیح البخاری: رقم 4186)

+ قال النبی لاہل بدر: «من افضل المسلمین...» (صحیح البخاری: رقم 2992)

+ ای الناس خیر؟ فقال النبی ﷺ: «القرن الذی انا فیہ، ثم الثانی، ثم الثالث» (صحیح مسلم: 6478)

5-عبد اللہ بن مسعود: ''فوجد قلوب اصحابہ خیر قلوب العباد، فجعلھم وزراء نبیہ، یقاتلون علی دینہ'' (مسند احمد: 379/1، رقم 3600)

+ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ: ''وخیار ہذہ الامۃ ہم الصحابۃ، فلم یکن فی الامۃ اعظم اجتماعا علی الھدی ودین الحق، ولا ابعد عن التفرق والاختلاف منہم، وکل ما یذکر عنہم مما فیہ نقص، فھذا اذا قیس الی ما یوجد فی غیرہم من الامۃ کان قلیلا من کثیر، واذا قیس ما یوجد فی الامۃ الی ما یوجد فی سائر الامم کان قلیلا من کثیر، وانما یغلط من یغلط انہ لینظر الی السواد القلیل فی الثوب الابیض وینظر الی الثوب الاسود الذی فیہ بیاض۔'' (منہاج السنۃ: 242/3)

6- ﴿رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ، اولئک حزب اللہ، الا ان حزب اللہ ہم المفلحون﴾ (المجادلۃ: 22)

7- ﴿فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اہتدوا﴾ (البقرۃ: 137)

8- «لعل اللہ ان یکون قد اطلع علی اہل بدر فقال: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم» (صحیح البخاری: 3028)

9- ﴿لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل، اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنی﴾ (الحدید: 10)

+ ﴿الذین آمنوا وہاجروا وجاہدوا فی سبیل اللہ باموالہم وانفسہم اعظم درجۃ عند اللہ واولئک ہم الفائزون﴾ (التوبۃ: 20)

10- عن محمد بن الحنفیۃ قال قلت لابی: ای الناس خیر بعد رسول اللہ ﷺ قال: ابوبکر قلت ثم من قال ثم عمر ... (صحیح البخاری: 3698)

+ سمع النبی ﷺ یقول یوم خیبر: لاعطین الرایۃ رجلا یفتح اللہ علی یدیہ، فقاموا یرجون لذلک ایہم یعطی، فغدوا وکلہم یرجو ان یعطی، فقال: این علی؟...» (البخاری: 2942)

11- قال رسول اللہ ﷺ: «ابوبکر فی الجنۃ وعمر فی الجنۃ وعثمان فی الجنۃ وعلی فی الجنۃ وطلحۃ فی الجنۃ والزبیر فی الجنۃ وعبد الرحمن بن عوف فی الجنۃ وسعد فی الجنۃ وسعید فی الجنۃ وابو

عبیدة بن الجراح فی الجنة۔ (سنن الترمذی: 3747)

12- عن ابی بکر رضی اللہ عنهم قال ارقبوا محمدا ﷺ فی اہل بیتہ (صحیح البخاری: 3741)

13- الامام ابن ابی العز الحنفی: فانهم لم ینقلوا نظم القرآن وحدہ، بل نقلوا نظمہ ومعناہ، ولا کانوا یتعلمون القرآن کما یتعلم الصبیان، بل یتعلمونہ بمعانیہ۔ ومن لا یسلک سبیلهم فانما یتکلم برایہ... (شرح العقیدة الطحاویة: ص (120)

+ عبد اللہ بن عمر: اولئک اصحاب محمد ﷺ کانوا خیر ہذہ الامة ابرہا قلوبا واعمقہا علما واقلہا تکلفا، قوم اختارہم اللہ لصحبة نبیہ ولاقامة دینہ... (حلیة الاولیاء لابی نعیم احمد الاصبہانی: 305/1، وجامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر: ص 948/2)

14- «من دعا الی ہدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذلک من اجورہم شیئا» (مسند احمد بن حنبل: 397/2)

15- «تفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة قالوا ومن ہی یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی»۔ (جامع ترمذی: 2641)

16- ''الصحابة کلهم عدول من لابس الفتن وغیرہم باجماع من یعتد بہ۔'' (تقریب النواوی مع تدریب: 214/2 و 'مقام صحابہ' از مفتی محمد شفیع عثمانی: ص 77)

17- قال رسول اللہ ﷺ: «الانصار لا یحبہم الا مؤمن، ولا یبغضہم الا منافق فمن احبہم احبہ اللہ، ومن ابغضہم ابغضہ اللہ» (صحیح البخاری: 3783)

+ قال انس: فانا احب اللہ ورسولہ وابا بکر وعمر، فارجو ان اکون معہم (صحیح مسلم: 3639)

18- الامام ابو جعفر الطحاوی (م321ھ): ''ونحب اصحاب رسول اللہ ﷺ، ولا نفرط فی حب احد منہم، ولا نتبرا من احد منہم ونبغض من یبغضہم، وبغیر الخیر یذکرہم ولا نذکرہم الا بخیر وحبہم دین وایمان واحسان، وبغضہم کفر ونفاق وطغیان۔'' (شرح العقیدة الطحاویة: 57)

19- قال النبی ﷺ: «اللہم انتم من احب الناس الی قالہا ثلاث مرار» (صحیح البخاری: 3785)

20- قال رسول اللہ ﷺ: «لا تسبوا احدا من اصحابی، فان احدکم لو انفق مثل احد ذہبا، ما ادرک مد احدہم، ولا نصیفہ»۔ (صحیح مسلم: رقم 6488 واللفظ لمسلم، وصحیح البخاری رقم

(3700

+ عن عبد اللہ بن عباس، قال النبی ﷺ: «من سب اصحابی فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین» (المعجم للطبرانی: 12541، صحیح الجامع: 5111

+ عن عبد اللہ بن مسعود قال النبی ﷺ: «اذا ذکر اصحابی فامسکوا» (المعجم الکبیر للطبرانی: 10296 وتخریج الاحیاء للعراقی 50/1، حسن)

21- الحافظ ابن حجر: ''وقد اتفق اہل السنۃ علی ان الجمیع عدول، ولم یخالف فی ذلک الا شذوذ من المبتدعۃ۔'' (الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: 131/1)

22- ابن تیمیۃ: ''فمن تکلم فیما شجر بینہم - وقد نہی اللہ عنہ: من ذمہم او التعصب لبعضہم بالباطل - فہو ظالم معتد۔'' (مجموع الفتاوی: 432/4)

23- الامام احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیۃ: ''اما مجتہدون مصیبون واما مجتہدون مخطئون... ان اصابوا فلہم اجران وان اخطئوا فلہم اجر واحد والخطا مغفور لہم۔'' (مجموع الفتاوی: 155/3)

+ الامام یحیی بن شرف النووی: ''واما الحروب التی جرت، فکانت لکل طائفۃ شبہۃ اعتقدت تصویب انفسہا بسببہا، وکلہم عدول ومتاولون فی حروبہم وغیرہا، ولم یخرج شیء ذلک احدا منہم من العدالۃ؛ لانہم مجتہدون اختلفوا فی مسائل من محل الاجتہاد...'' (شرح مسلم للنووی: 118/8) (بحوالہ مجلۃ شہریۃ 'الداعی' تصدر من دارالعلوم دیوبند، الہند، مقالۃ علمیۃ ''موقف الامۃ المسلمۃ من مشاجرۃ الصحابۃ'' لمدیرہا نور عالم امینی)

24- امام احمد بن حنبل: ''کسی کے لیے صحابہ کرامؓ کا ذکر سو، یا ان پر طعن و تشنیع کرنا جائز نہیں۔ حاکم وقت پر فرض ہے کہ ایسا کرنے والے کو سزا دے، کیونکہ یہ جرم ناقابل معافی ہے۔ سزا دینے کے بعد اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کرے تو بہتر و گرنہ اسے دوبارہ سزا دی جائے اور اسے قید میں رکھا جائے جب تک کہ وہ توبہ کر کے اس فعل مذموم سے باز نہ آئے۔'' (الصارم المسلول: و رسالہ قیرانویہ: ص 419)

25- الامام ابن تیمیۃ: الاصل الخامس: 156 ۔ وفی اصحاب رسول اللہ ﷺ بین الروافض والخوارج... (العقیدۃ الواسطیۃ لابن تیمیۃ: ص 82)

26- ﴿ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب﴾ (الحج: 32)

27- ﴿قل اباللہ وآیاتہ ورسولہ کنتم تستہزئون ٥ لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم...﴾ (التوبہ: 65، 66)

28- وقد اتفق المسلمون علی ان من استخف بالمصحف مثل ان یلقیہ فی الحش او یرکضہ برجلہ اہانۃ لہ انہ کافر۔ (مجموع الفتاوی 425/8)

29- ﴿وما کان صلاتہم عند البیت الا مکآء وتصدیۃ﴾ (الانفال: 35)

30- ﴿ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لہم عذاب الیم فی الدنیا والآخرۃ﴾ (النور: 19)

31- یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ہزوا ولعبا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء﴾ (المائدۃ: 57)

الداعیان

علامہ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر (چیئرمین قرآن وسنہ موومنٹ پاکستان)
شیخ الحدیث مولانا محمد شفیق مدنی (مفتی جماعت)
ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی (وائس چیئرمین)
ڈاکٹر حافظ انس مدنی (ناظم دعوت وتبلیغ)
ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمٰن زاہد (چیئرمین پنجاب)

اگست کے دوسرے عشرے میں قطر اور مصر کی کوششوں سے ایک اور ڈرافٹ سیز فائر کا تیار کیا گیا جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ وہی ڈرافٹ تھے جسے اسیٹو وٹکوف نے جولائی میں پیش کیا تھا اور جس میں حماس نے تھوڑی ترمیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اب کی بار حماس نے بغیر کسی شرط وترمیم کے اس کو مان لیا مگر اسرائیل نے یہ کہتے ہوئے اس کو مسترد کر دیا کہ اب ہم حماس کو ختم کر دینے کے بالکل قریب ہیں۔ چنانچہ اس نے اس سیز فائر کو مسترد کر کے غزہ پر مکمل قبضہ کا اعلان کر دیا۔

غزہ میں یہ مذاکرات بار بار صرف نتن یاہو کی ضد کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے دو ملین (بیس لاکھ سے زائد) فلسطینی بھوک اور پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ غزہ میں وحشت ناک حد تک بھک مری، دواؤں کی قلت اور خوراک کی کمی ہو چکی ہے، جس کی وجہ سے بچے اور بوڑھے اور مریض بلک بلک کر جان دے رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے اب باضابطہ غزہ میں بھک مری کا اعلان کر دیا ہے۔ چاروں طرف سے اسرائیل کا محاصرہ ہے۔ چھ ہزار امدادی ٹرک مختلف کراسنگس (رفح بارڈر، معبر کرم ابو سالم، فلاڈلفیا کاریڈور وغیرہ) پر مہینوں سے امدادی سامان لیے اسرائیلی اجازت کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان پر جو غذائی سامان لدا ہوا ہے وہ اب خراب ہونے لگا ہے۔

یو این او کی امدادی ایجنسی اونروا کا کہنا ہے کہ اس کے پاس کم از کم دو ملین لوگوں کی غذائی ضرورت دو مہینے تک پوری کرنے کا سامان موجود ہے مگر اس کو امریکہ اور اسرائیل امدادی خدمات انجام ہی دینے نہیں دیتے اس بہانہ سے کہ اس کے ذریعہ حماس کے لوگوں تک یہ سامان پہنچ جائے گا۔ اونروا پر حماس کا ساتھ دینے کا یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ یہاں تک کہ 26 جولائی کو خود امریکہ کی متعیّن کردہ تفتیشی ایجنسی نے اونروا کو کلین چٹ دی اور کہا کہ اسے کوئی شواہد نہیں ملے کہ حماس نے بین الاقوامی امدادی سامان کی چوری کی ہو یا اونروا کسی غلط مقصد کے لیے استعمال ہوئی ہو۔ اس کے مقابلہ میں غزہ ہیومینٹیرین ایڈ (GHA) نامی جس ادارے کو امریکہ اور اسرائیل نے سیٹ کیا ہے، وہ غزہ کے لیے لوگوں کے لیے ایک ڈراونا خواب بن چکا ہے۔ وہ وہاں امداد لینے جاتے ہیں اور ان پر اسرائیلی فوجی فائر کھول دیتے ہیں۔ اب تک ایک

ہزار لوگوں کو اس طرح سے شہید کیا جا چکا ہے۔ مصر کی شقاوت اور جنرل سیسی کی بدبختی کہ اُس نے اسرائیلی کنٹرول سے باہر واحد کراسنگ رفح بارڈر کو بھی بند کر رکھا تھا۔ اور شیخ الازہر نے اسرائیل کے خلاف اور غزہ کے حق میں جو فتویٰ جاری کیا تھا اُس کو بھی سیسی کے دباو میں واپس لینا پڑا۔

مصریوں کی اس بے حسی و بے غیرتی پر شدید دکھ کا اظہار عرب سوشل میڈیا پر جب شروع ہوا تو سیسی کے خلاف ہیش ٹیگ مہم چلی، نیز مظاہرین نے نعرے لگائے: حکومات عربية يا للعار باعوا غزة بالدولار (عرب حکومتیں ہائے ہائے، انہوں نے غزہ کو ڈالر کے لیے بیچ ڈالا) تو شاید مصریوں کو کچھ غیرت آئی اور انہوں نے رفح بارڈر سے 167 امدادی ٹرک غزہ کے اندر بھجوائے جو اونٹ کے منہ میں زیرہ کی مصداق تھے۔ بعض لوگوں نے سمندر میں کچھ اشیاء خورد و نوش پھینکیں۔

دنیا بھر میں، یورپ و امریکہ میں، افریقہ کے عرب مسلم ملکوں تیونس، الجزائر وغیرہ میں لوگ اب بھی بڑی تعداد میں سڑکوں پر نکل کر آ رہے ہیں، اگر کہیں سکوت طاری ہے تو وہ ہیں ترکی، پاکستان، سعودی عرب، امارات، اردن، بحرین، انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ۔ قطر اور مصر ثالثی کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

مزاحمت کی قوتوں نے پوری شدت سے اسرائیل کا راستہ روکنے کا اعلان کیا ہے۔ ڈونالڈ ٹرمپ اسرائیل کو پہلے ہی گرین سگنل دے چکا ہے۔ اسرائیل کے اندر جو شدید ردعمل غزہ پر قبضہ کے اعلان کے خلاف نظر آیا وہ کامیاب ہوتا دکھائی نہیں دے رہا ہے کیونکہ اس میں بائیں بازو کے اسرائیلی ہیں یا اسرائیلی یرغمالیوں کے کنبے والے۔ اسرائیل کسی پریشر میں نہیں آ رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب ممالک میں حالات نارمل ہیں بقیہ مسلم دنیا میں سب عیش کی کاٹ رہے ہیں عوام کے دل بس غزہ والوں کے لیے دھڑکتے ہیں مگر وہ کچھ کر نہیں رہے ہیں۔ آذربائیجان (جو مسلم ملک ہے) سے براہ ترکی اسرائیل کو گیس کی سپلائی پورے طور پر جاری ہے۔ یورپی ممالک (جرمنی فرانس، یوکے اور کینیڈا وغیرہ آنے والے ستمبر میں آزاد فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کی بات کر رہے ہیں) مگر جب کسی ریاست کے مکینوں کا ہی خاتمہ کر دیا جائے گا تو اس کا تسلیم کر لینا چہ معنی دارد؟ اسی کو کہتے ہیں کہ ع ”بہت دیر کر دی مہرباں آتے آتے“۔

اگر یہی ممالک اب سے ایک سال پہلے فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیتے تو اسرائیل پر یقیناً اس کا بڑا پریشر پڑتا۔ اب اس قدم سے اسرائیل کو بہت زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑے گا کہ شرق اوسط میں اسرائیل اب خود ایک امپیریل پاور بن چکا ہے۔ نتن یاہو کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ تو اب گریٹر اسرائیل کے اپنے منصوبہ کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اب وہ اور اس کے دائیں بازو والے وزیر تورات کے حوالہ سے بات کرتے ہیں۔ نتن یاہو خود کو یہود کا ایک تاریخ ہیرو سمجھتا ہے جس کا ”روحانی و اخلاقی فرض ہے کہ وہ اسرائیل عظمیٰ قائم کرے“۔ حماس اس کے راستہ کی آخری چٹان ہے۔ جسے خود عرب ممالک اپنی پھسپھسی اور غلامانہ خارجہ پالیسی کے تحت برباد کر چکے ہیں۔ حالانکہ حماس کی اب تک کی تاریخ رہی ہے کہ اُس نے کبھی عرب ممالک کی اندرونی پالیسیوں میں کوئی مداخلت نہیں کی نہ ان کے خلاف کبھی کوئی بیان دیا۔ الٹے

سعودی اور اماراتی پیرول پر رہنے والے سلفی مدخلیوں نے زہریلا پروپیگنڈا اس کے خلاف جاری رکھا ہوا ہے۔ شروع میں بعض ایسے بھی شقی، بے شرم اور بے حس تھے کہ حماس کے قائدین کی شہادت پر خوشیاں مناتے تھے! اب لہجہ میں تو تبدیلی آئی ہے، اب بھی غزہ میں جو قتل عام عورتوں بچوں بوڑھوں کا ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار یہ بے خبر اور فریب خوردہ لوگ اسرائیل کے بجائے حماس کو بتا رہے ہیں!

اب اسرائیل نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوجیوں کے ساتھ غزہ پر مکمل قبضہ کے لیے حملہ کر دیا ہے جس کو اس نے Gidion Chariot 2 کا نام دیا ہے۔ جواب میں مزاحمتی فورسز نے حجارۃ داؤد کے ذریعہ ان کا مقابلہ شروع کیا ہے اور انہوں نے گوریلا اور استشہادی سرگرمیاں بھی تیز کر دی ہیں۔ جن میں صہیونیوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے، گو جانی نقصان ابھی کم ہے۔ مگر اسرائیلی بڑے بزدل لوگ ہیں اس لیے ایک فوجی بھی مرتا ہے تو اس کا ماتم ساری قوم مناتی ہے۔ اسرائیل اپنے نقصانات چھپاتا بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دو سال میں اس کے صرف 90 فوجی مارے گئے ہیں۔ لیکن امور فلسطین کے ماہر اور سابق سفیر پروفیسر آفتاب عالم پاشا میڈیا اسٹار ورلڈ کے محمد احمد کاظمی کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے جو گنتی کی ہے اس کے حساب سے اسرائیل کے 2500 فوجی اب تک واصل جہنم ہوئے ہیں جبکہ شدید زخمیوں کی تعداد بھی 22 ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان میں بہت سے لوگ اپاہج ہیں اور بہت سے نفسیاتی مریض۔ اسرائیلی سماج Introvert (اپنے آپ میں بند اور گم) سماج ہے۔ اس نقصان کا بڑا اثر پڑ رہا ہے۔

نتن یاہو کی سب سے بڑی حمایت امریکہ کے وہ صہیونی عیسائی کرتے ہیں جنہوں نے ٹرمپ کو حصار میں لیا ہوا ہے اور ان کی مرضی کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ جہاں تک غزہ میں اسرائیل کی نئی فوجی کارروائی کی بات ہے تو پہلے ہی سے 75 فیصد غزہ پر قابض ہے اور اس کو برباد کر چکا ہے۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا؟ جو باقی ماندہ غزہ بچا ہے اس کو بھی تباہ کر دے گا۔ ٹرمپ اور نتن یاہو کا اصل پلان یہی ہے کہ غزہ کو پوری طرح برباد اور خالی کرا کر قتل عام سے بچے ہوئے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں منتقل کر دیا جائے جن میں انڈونیشیا، لیبیا، سوڈان اور صومالی لینڈ وغیرہ سے بات چیت چل رہی ہے۔ اس کے بعد فلسطینی مسئلہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا لیا جائے گا۔

ایسے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ مزاحمتی قوتیں کس طرح مقابلہ کرتی ہیں اور اگر وہ 'عربات جدعون اول' کی طرح اسرائیل کے اس حملے کو بھی ناکام کر دیتی ہیں تو پھر نتن یاہو اپنے منصوبوں میں ناکام ہو جائے گا۔ خدانخواستہ اگر حماس ناکام ہوتی ہے تو پھر لبنان اور شام کی طرح مصر اور اردن کو جان لینا چاہیے کہ اسرائیل کا اگلا ہدف وہی ہوں گے۔ اور اگر اسرائیل ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو ان میں اتنا دم خم نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔ اقوام متحدہ کچھ نہیں کرے گا۔ عرب لیگ مذمت کے بیانات جاری کرے گی، سعودی عرب اور امارات ٹرمپ کی بارگاہ میں فریاد کریں گے اور جواب میں وہ تانا شاہ ان سے مزید دولت بٹورے گا اور ان سے کہے گا کہ اسرائیل نے مغربی کنارے اردن، شام اور لبنان و مصر کے جتنے علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے سیکورٹی کے لحاظ سے وہ اسرائیل کے لیے اہم ہیں لہٰذا ان کو ان علاقوں سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ جیسا کہ

وہ Territory for Peace کے بے ہودہ نام سے یوکرین کو مجبور کر رہا ہے کہ اس کے جتنے علاقہ پر روس نے قبضہ کر لیا ہے اب وہ ان پر کمپرومائز کر لے۔

اسی مہینے نیویارک میں ہونے والی سعودی عرب اور فرانس کی مشترکہ ”فلسطین کانفرنس“ امریکہ کی شدید مخالفت کی وجہ سے اعلامیہ جاری کرنے اور کمیٹیاں تشکیل دینے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی اور ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ دکتور محسن ابوصالح کہتے ہیں کہ ”اس کے مقاصد اچھے تھے مگر نظامِ عمل کا فقدان تھا“۔

اقبال نے کہا تھا: ع ”ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات“۔ اس دنیا میں طاقت ہی فیصلہ کن قوت ہوتی ہے۔ اہل ایمان کو: ”واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ“ (انفال: 60) کا حکم اسی لیے دیا گیا تھا۔ موجودہ زمانہ کی مزعومہ روشن خیالی، جدتِ فکر، ترقی اور ریسرچ وٹیکنالوجی کی تمام تر بلندیوں کے باوجود دنیا جیسی کل تھی ویسے ہی آج بھی ہے۔ بس طاقت کے سورسز اور رسورسز بدل گئے ہیں۔ جو قوم طاقت ور ہے اور طاقت کے سورسز پر قابض ہے اُسی کی حکمرانی ہے۔ یہودیوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور تعداد میں بہت تھوڑے ہوتے ہوئے بھی وہ آج بائی پراکسی پوری دنیا پر رول کر رہے ہیں۔ ان کے آگے کھڑے ہونے کے لیے مزاحمتی قوتوں کو بھی اپنے اندر وہی طاقت پیدا کرنی ہوگی۔

بظاہر عرب ملکوں میں کسی بدلاؤ اور انقلاب کی امید بہت کم ہے۔ عرب اسپرنگ کو خلیج کے ثروت مند حکمرانوں نے اپنی مداخلت سے جس طرح سبوتاژ کیا تھا اُس سے عوام میں فرسٹریشن ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ ممالک زیادہ تر پولیس اسٹیٹ ہیں۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ انقلاب کبھی بتا کر نہیں آتا، اُس کے لیے بسا اوقات ایک ہی چنگاری کافی ہو جاتی ہے۔ غزہ میں معصوموں کا اتنا خون بہہ گیا ہے کہ عرب عوام اب بھی نہ اٹھے تو پھر ان کو بس امریکہ اور اسرائیل کی بدترین غلامی کے لیے تیار رہنا چاہیے!

غزہ میں جنگ بندی کیوں نہیں ہو رہی؟ — ایک نظر میں

1۔ اسرائیلی سیاسی قیادت کے اہداف

اسرائیل کی موجودہ حکومت، بالخصوص وزیر اعظم بنیامین نتن یاہو، اپنے سیاسی مستقبل اور اندرونی دباؤ سے نمٹنے کے لیے جنگ کو طول دے رہا ہے۔ نتن یاہو پر بدعنوانی کے الزامات ہیں اور اسے عوامی احتجاجات کا سامنا ہے، اور جنگ کی موجودگی اس کے لیے "قومی سلامتی" کے نام پر سیاسی بقا کا ایک ذریعہ بن گئی ہے۔

2۔ مکمل ہدف کا حصول (حماس کا خاتمہ)

اسرائیل کا سرکاری موقف یہ ہے کہ جنگ کا مقصد حماس کو مکمل طور پر ختم کرنا ہے۔ جب تک یہ ہدف پورا نہیں ہوتا، اسرائیل جنگ بندی کو ایک "ادھورا کام" تصور کرتا ہے۔ تاہم، ماہرین کا ماننا ہے کہ حماس جیسی تنظیم کو مکمل طور پر ختم کرنا زمینی حقائق کے برعکس ایک خواب ہے۔

3۔ امریکی حمایت اور بین الاقوامی دوہرا معیار

اگرچہ دنیا کے کئی ممالک جنگ بندی کا مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن امریکہ اب تک اسرائیل کو فوجی امداد بھی فراہم کر رہا ہے اور سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قراردادوں کو ویٹو بھی کرتا رہا ہے۔ یہ عملی حمایت اسرائیل کو جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ کتنا ہی انسانیت کے خلاف جرائم کرے فوری طور پر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

4۔ حماس کے مطالبات اور اسرائیلی انکار

حماس کی طرف سے مستقل جنگ بندی کے لیے شرائط رکھی گئی ہیں — مثلاً غزہ سے فوجی انخلا، معاشی محاصرہ ختم کرنا اور اسرائیلی جیلوں میں بند فلسطینی قیدیوں کی رہائی — جنہیں اسرائیل فوری طور پر ماننے کو تیار نہیں۔ جبکہ موجودہ سیز فائر مسودہ میں یہ شرطیں بھی حماس نے حذف کر دی تھیں مگر اسرائیل نے پھر بھی اس کو تسلیم نہیں کیا۔

ان وجوہ سے جنگ بندی کی کوششیں بار بار ناکام ہو رہی ہیں۔ اسرائیل اور امریکہ دونوں کی نیت کسی اچھے ارادہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ دونوں بس اسرائیلی یرغمالیوں کو حماس کی قید سے رہا کروانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد لاکھ امریکی وعدوں اور ضمانتوں کے باوجود سب جانتے ہیں کہ اسرائیل فوراً غزہ پر دوبارہ حملے کرے گا اور اپنے اہداف یعنی حماس کا خاتمہ اور یوں فلسطینی جدوجہد آزادی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

5۔ خطے میں بڑی طاقتوں کا مفاد

امریکہ، روس اور چین سب ہی اس خطہ میں اپنے مفادات کا حصول چاہتے ہیں مگر ابھی امریکہ کو سب پر اَپر ہینڈ ملا ہوا ہے کیونکہ خطہ کی تمام بڑی عرب حکومتیں امریکی چھتری کے نیچے ہیں۔ وہ اگرچہ روس اور چین کے ساتھ بھی تعلقات استوار کر رہی ہیں تاہم امریکہ اپنی فوجی قوت کے ذریعہ بالکل ان کے سروں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی طور پر امریکہ یا اسرائیل دونوں کے لیے کچھ خطرہ بن سکیں یا ان کی مخالفت ہی کر سکیں۔

امریکہ تو بہت کھل کر اسرائیل کے ساتھ ہمیشہ ہی رہتا ہے مگر روس اور چین دونوں کی پالیسی گومگو کی ہے، وہ نہ کھل کر اس کی حمایت کرتے ہیں اور نہ کھل کر مخالفت۔ مخالفت کرتے بھی ہیں تو بس بیان بازی کی حد تک۔ ورنہ چین سے اسرائیل کو اسلحہ کی سپلائی بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے، اور روس کی حمایت بھی اس کو حاصل ہے کیونکہ اسرائیل میں روسی نژاد یہودی بیس فیصد سے بھی زیادہ ہیں۔ ان کے علاوہ خطہ کی دو بڑی معیشتیں سعودی عرب اور امارات میں سے امارات تو کھل کر اسرائیل کے پالے میں جا چکا ہے۔

سعودی عرب ابھی پس و پیش میں ہے مگر یہ سب جانتے ہیں کہ خفیہ طور پر اس کے تعلقات اسرائیل سے کب کے قائم ہو چکے ہیں، وہ تو عوامی ردعمل کا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے ردعمل کا خوف ہے جو ابھی سعودی عرب کو اس کا باضابطہ اعلان کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ باقی خطہ کے دوسرے چھوٹے ممالک یا تو سعودی کیمپ میں ہیں یا امارات کے

دست نگر۔ قطر ان دونوں سے آزاد ہے مگر امریکہ کی بیڑیوں میں کسا ہوا ہے اور ویسے بھی اس کا رقبہ چھوٹا، دفاعی صلاحیت نہ کے برابر لہٰذا اس کی بہت زیادہ تزویراتی اہمیت نہیں ہے۔ البتہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ عرب ممالک میں صرف وہی ہے جو کھل کر فلسطینیوں کے حقوق کی بات کرتا ہے اور غزہ پر مسلط اس جنگ کو رکوانے کی مسلسل کوششیں کر رہا ہے۔

6۔ انسانی بحران کو نظر انداز کرنا

غزہ میں بدترین انسانی بحران پیدا ہو چکا ہے، لیکن چونکہ فلسطینیوں کو عالمی سیاست میں انسان نہیں بلکہ صرف "سیکورٹی مسئلہ" سمجھا جاتا ہے، اس لیے انسانی ہمدردی کے تقاضے پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔ بڑی عرب معیشتیں سعودی عرب اور امارات امریکہ پر (اس سے مہنگے معاشی سودے کرنے کی وجہ سے) کچھ دباؤ بنا سکتی تھیں مگر انہوں نے خاموشی کو ہی ترجیح دی ہے۔ سعودی عرب کو غزہ کے انسانوں کی نہیں اپنے منصوبہ ویژن 2030ء کی کامیابی کی فکر ستا رہی ہے اور امارات کو اپنے ملک میں AI (مصنوعی ذہانت) کے منصوبہ کی تکمیل کی فکر ہے!

7۔ ثالثی کی کوششوں میں سنجیدگی کا فقدان

مصری، قطری اور امریکی ثالثی کے باوجود اب تک کوئی پائیدار حل سامنے نہیں آسکا۔ ہر فریق اپنے مفادات کے مطابق ثالثی کرتا ہے، نہ کہ فلسطینی عوام کی زندگی بچانے کی نیت سے۔ قطر ایک بہت چھوٹا اور کمزور کھلاڑی ہے جو اپنی حفاظت کے لیے بھی امریکہ پر ہی منحصر ہے۔ مصر امریکہ سے زبردست معاشی امداد سالانہ وصول کرتا ہے جو اس کی فوج کی جیب میں جاتی ہے اور فوج ہی ملک پر قابض ہے۔ لہٰذا مصر امریکی خواہشات کے برخلاف نہیں جا سکتا ہے، اور امریکہ خود جانبدار ثالث ہے۔

نتیجہ

عرب اور اسلامی ممالک کی اسرائیل کی مخالفت صرف زبانی جمع خرچ ہے اور عملاً وہ کچھ نہیں کرتے نہ غالباً کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو اسرائیل اور امریکہ دونوں اچھی طرح جانتے ہیں۔ خود اسرائیل کے اندر جنگ کے خلاف جو آوازیں اٹھ رہی ہیں وہ بہت کمزور ہیں اور زیادہ تر بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں، جبکہ اسرائیلی سماج پوری طرح دائیں بازو کے جنونی صہیونیوں کے زیر اثر ہے جو حقیقتاً تمام فلسطینیوں کو ختم کرنے اور مغربی کنارہ اور غزہ پر اسرائیل کے مکمل قبضہ کی حمایت کرتا ہے۔ اور اس کے دباؤ میں ہی 25 جولائی 2025ء کو اسرائیلی کنیسٹ نے یہ قانون پاس کر دیا ہے کہ مغربی کنارہ کو اسرائیل میں ضم کر لیا جائے۔ اس کوشش کو امریکی صدر ٹرمپ کی پہلے ہی سے حمایت حاصل ہے۔ غزہ میں جنگ بندی نہ ہونے کی بنیادی وجہ صرف "جنگ" نہیں، بلکہ عالمی سیاست، مفادات کی جنگ، اور انسانی جان کی بے توقیری ہے۔ جب تک اس طرز فکر میں تبدیلی نہیں آتی، جنگ بندی کی تمام کوششیں عارضی اور ناکام ہی رہیں گی۔ اب بظاہر جنگ بندی کا زیادہ امکان اس چیز میں دکھائی دیتا ہے کہ حماس اور دوسری مزاحمتی تنظیمیں گوریلا حملوں سے اسرائیلی فوج اور

اہداف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔ ایک یہی چیز ہے جو اسرائیلی سماج کو جنگ بندی کے لیے تیار کر سکتی ہے۔

ایک دوسرا امکان یہ ہو سکتا تھا کہ فرانس، انگلینڈ اور دوسرے مغربی ممالک فلسطینی ریاست کو فوراً اور غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیں جس سے اسرائیل مزید پریشر میں آئے۔ اور امریکہ خود کسی اور علاقہ میں زیادہ شدت کے ساتھ انوالو ہو جائے۔ بظاہر اب یہ امکان دم توڑتا نظر آ رہا ہے۔ بہر حال مسلم دنیا پر ایسا ہی موت کا سکوت طاری ہے جیسے کبھی

- حسینؓ کے قافلہ کو تمام مسلمانوں نے کربلا میں بے یار و مدد گار چھوڑ دیا تھا،
- اور جیسے 1492ء میں خلافتِ عثمانیہ جیسی سپر پاور اور مصر کے سلطانوں نے اندلس میں اسلام کی ٹمٹماتی شمع غرناطہ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا، جس کو صلیبی بھیڑیوں نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور اقتصادی ناکہ بندی کر کے ویسے ہی بھک مری کے حالات پیدا کر دیے تھے، جن حالات سے آج اہلِ غزہ دوچار ہیں۔
- نوے کی دہائی میں بوسنیا میں بھی یہی المیہ پیش آیا تھا جب اس کے دارالحکومت سرائیوو کو مسیحی سربوں نے تین سال تک محاصرہ میں لیے رکھا اور وہاں بھی زندگی بہت مشکل بنا دی تھی۔ بوسنیا کے قائد علی عزت بیگووچؒ خود ایک خندق میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے۔ اس وقت سوشل میڈیا نہیں تھا جب سربرینیکا میں سربوں کے ذریعہ دس ہزار مسلمان نہتے مرد و زن کے بہیمانہ قتل کی واردات بعض بہادر صحافیوں کے ذریعہ دنیا کے سامنے آئی تو نیٹو کو شرم آئی اور پھر انہوں نے سربوں پر بمباری کر کے ان کو مجبور کیا کہ سارا جیوو کا محاصرہ ختم کریں۔

افسوس کہ غزہ کے مسلمان تو یورپ میں بھی نہیں بلکہ عین اسلامی دنیا کے قلب میں ہیں۔ اگر وہ یورپ میں ہوتے تو شاید ناٹو ان کو بچا لیتا مگر وہ عربوں اور مسلمانوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ جن کی، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ، اخلاقی صورت حال بالکل وہی ہو گئی ہے جس کا اقبال نے ماتم کیا تھا یہ کہہ کر

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

When the West detached itself from the social role of religion, there was a specific historical context that made it impossible for the West to bring religion along on its journey of social evolution.

One aspect of this context is that for centuries during the Dark Ages in the West, when kings and feudal lords ruled, it was an era of tyranny and oppression. The common citizen was forced to live a life worse than that of animals. In this system of oppression, religion, as an institution, was an accomplice to the king and the feudal lords and supported their atrocities. Therefore, when the public revolt against the monarchy and feudal lords succeeded, the religion that supported them was also expelled from social life along with them.

The second aspect is that when the era of scientific evolution began in the West and scientific study and inventions progressed, religion became an adversary. It issued fatwas of apostasy and heresy against scientists and ordered their deaths, leading to the killing of thousands. I have personally seen the place in Oxford where religious courts were held during that era, and those who researched science, technology, and geography were declared heretics and apostates and sentenced to death. Therefore, for science to advance, it became necessary to get rid of religion, which was an obstacle in its path, and that's what happened.

Our question to Western intellectuals is this: when they rejected the social role of religion, it was due to a specific historical context with its own causes and reasons. This makes the West's renunciation of religion understandable. But why does the West want to impose its own historical context on us Muslims? Our history is not the same. In our 1400-year past, it has never been the case that religion became a partner of coercion and power instead of reason, truth, and principles. As a religion, Islam has always been a companion of principles, truth, and reason. It has been a supporter of the oppressed, and it has never, as an institution, supported oppression, tyranny, and power. The history of our scholars is full of imprisonments, martyrdoms, and sacrifices. They gave their lives and accepted the loneliness of prisons, but they never bowed their heads before the oppressor and tyrant. The role of our religious leaders in this regard has always been magnificent.

Similarly, Islam has never stood in the way of science and has never been an obstacle to the evolution of technology. In fact, all the scientific progress of the West is due to the educational institutions of Muslim Spain, which paved the way for the evolution of their society in science and technology. However, our real tragedy is that Muslim Spain, having been defeated on the battlefield, lost the ability to make progress in

this field itself. It was based on their research that the West began its journey of scientific evolution.

In this context, our complaint to the West is that it is making an unjust attempt to impose its specific historical context on the whole world, especially on Muslims. It is trying to force us to abandon our bright past by showing us its own dark past.

The second point to discuss with the West is to examine the effects and consequences of its religion-averse philosophy and culture on Western society, which began with the French Revolution. This religion-averse philosophy, despite the support and backing of science and technology, has not played a positive role in the evolution of human society. As a result of this anti-religious sentiment, the Western family system has been destroyed, the sanctity of relationships has been trampled upon, and relationships barely exist anymore. This Western philosophy of "individualism" has shaken the foundations of mutual cooperation and solidarity in human society, has led to the death of spiritual and moral values, and today, even Western intellectuals themselves are worried about the results of this anti-religious philosophy and are searching for a way back.

We should discuss this point with Western intellectuals: seeing the negative consequences of their religion-averse secular philosophy, why do they still demand that we Muslims, like them, abandon the social role of religion, lose our secure family system, bid farewell to mutual relationships and social ties, and turn away from spiritual and moral values to seek mental peace and inner tranquility through drugs and psychiatrists?

Here, I feel it is necessary to clarify one thing: the role that religion played in the West during the Dark Ages, which even today makes Westerners shudder and which they are so afraid of that whenever the social role of religion is discussed anywhere in the world, the West considers itself an adversary, also has a specific historical context and reasons. One of them is that Christianity did not, and still does not, have a preserved and authentic collection of the Torah and the Gospel. As a result, the ultimate authority for the interpretation of religion was given to the Pope and the Church. And instead of reason, an individual or a group of people became the final authority in the interpretation and exegesis of religion. This was the reason for their absolute power.

However, in Islam, reason and argumentation have always been given precedence. The Holy Quran and the sayings of the Holy Prophet (peace be upon him) are available in a preserved and authentic form. Therefore, in Islam, after the revered personality of the Holy Prophet (peace be upon him), no individual or group has the ultimate authority to interpret religion. Everyone has to speak with reason and support their position and opinion with arguments from the Quran and Sunnah. Even the views and opinions of the Rightly Guided Caliphs and the Jurist Imams have been disagreed upon on hundreds of matters based on reason. Therefore, in Islam, there is absolutely no possibility for an individual or a group to achieve the status of final authority in the interpretation of religion, deviating from reason and argumentation.

When we talk to Western intellectuals, this point will also be discussed: why are they putting Christianity and Islam in the same boat despite such a clear difference in their intellectual and social roles? And why are they busy trying to impose the West's specific historical context on Muslims in this matter as well?

The history of the last 1500 years is a witness that the intellectual role of Islam and Christianity has been different from each other, and their social roles have also been distinct and completely separate from each other. Therefore, if the people of the West did not find their religion suitable due to its specific historical context and role, they cannot be given the right to reject other religions as well and force the whole world to abandon their faith and religion.

سانحۂ اِرتحال

سانحۂ ارتحال کی اطلاعات اور نمازِ جنازہ کا احوال

صوتی تعزیت

ٹیلیفون کالز، وائس میسجز اور سوشل میڈیا پر آڈیو ویڈیو پوسٹس

تعزیتی مکاتیب

زعماء، جامعات اور اداروں کی جانب سے تعزیتی خطوط

یادگاری مضامین

قدرے طویل تحریروں کی صورت میں تذکرہ اور یادیں

وفات حسرت آیات

مختصر سے درمیانی طوالت کی تحریروں میں مغموم تاثرات

منظوم اظہارِ تعزیت

اشعار کی صورت میں قلمبند کیے گئے اظہار ہائے تعزیت

اہلِ خاندان کا صدمہ

افرادِ خاندان کے تحریر کردہ تاثرات و احساسات

تقریبات کا احوال

تعزیتی مجالس میں پیش کیے گئے جذبات و خیالات

افکار و آثار

حضرت قارنؒ کی تقاریر اور اصحابِ قلم کی تحریروں میں تذکرہ